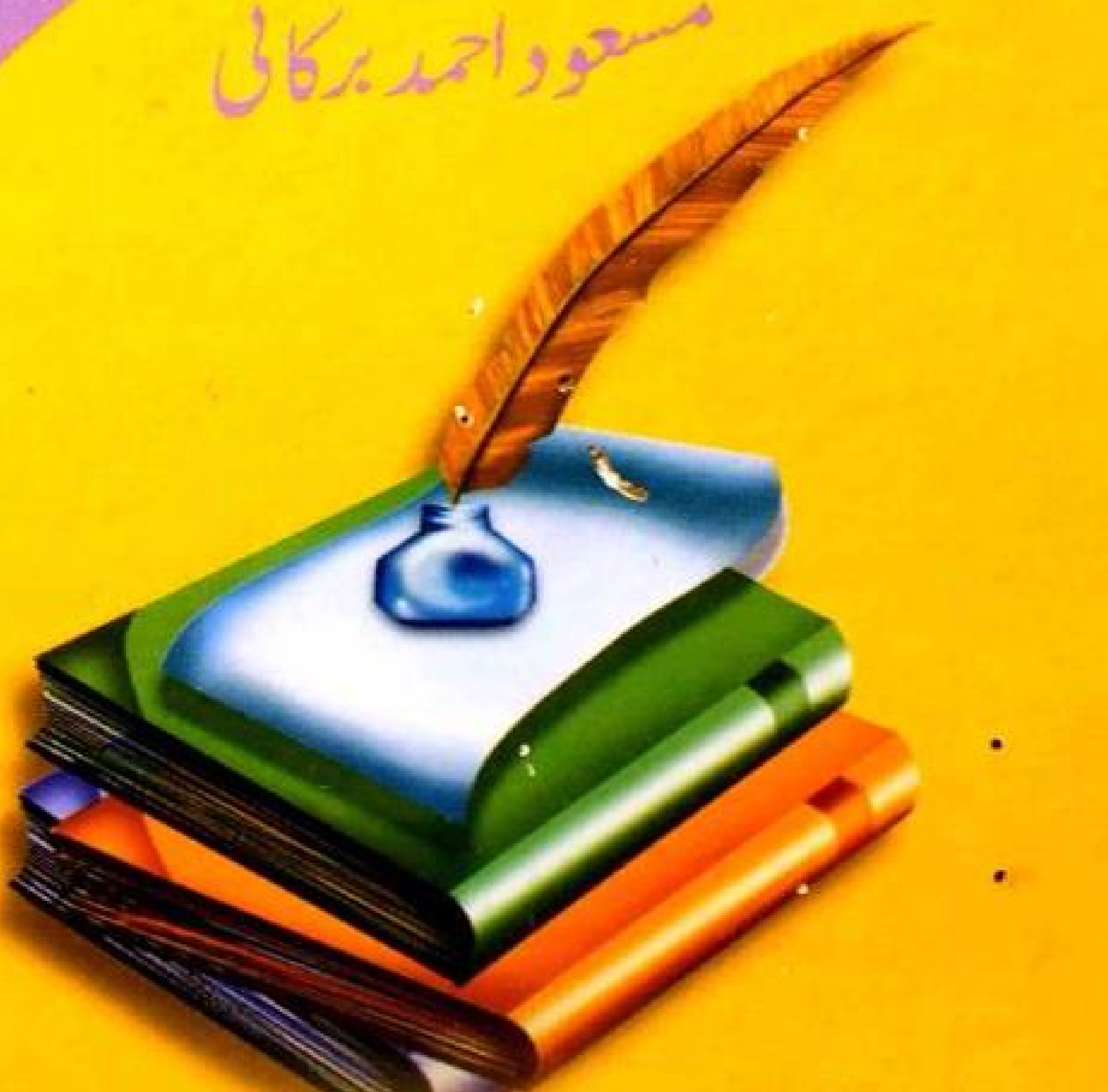
ادبی مقالاتِ سعید

زبان و ادب پر حکیم محمد سعید شہید کی تحریریں

مرتبہ:
مسعود احمد برکاتی



ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان، کراچی

ادبی مقالات سعید

زبان و ادب پر حکیم محمد سعید شہید کی تحریریں

مرتبہ

مسعود احمد برکاتی

ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان، کراچی

نام کتاب	:	ادبی مقالات سعید
مصنف	:	حکیم محمد سعید شہید
مرتب	:	مسعود احمد برکاتی
ناشر	:	ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان ہمدرد سینٹر، ناظم آباد، کراچی
طابع	:	ماس پرنٹرس، ناظم آباد، کراچی
اشاعت اول	:	۲۰۰۰ء
تعداد	:	ایک ہزار
قیمت	:	۷۵ رپے
سرورق	:	منصور غنی
صفحات	:	۱۰۴

ترتیب

حرفِ اوّل

مسعود احمد برکاتی

بعض پہلودار شخصیات کی زندگی کا کوئی ایک پہلو بہت زیادہ نمایاں ہوجاتا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی بعض دوسری حیثیات پر لوگوں کی نگاہ کم جاتی ہے یا وہ حیثیات بالکل ہی دب جاتی ہیں۔ ایسی شخصیات کے مداح بھی ان کی ایک حیثیت یا چند حیثیات پر ہی متوجہ رہتے ہیں۔ حکیم محمد سعید شہید کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ سب سے زیادہ اہم حیثیت تو ان کی طبیب کی تھی۔ وہ ایک حاذق اور مقبول طبیب تھے اور انھوں نے لاکھوں مریضوں کا علاج کیا۔

علاج معالجے اور دوا سازی کے علاوہ سماجی، تعلیمی اور علمی و ادبی کام بھی ان کی سرگرمیوں کا اہم حصہ تھے۔ ۱۹۵۳ء میں حکیم صاحب نے ہمدرد کو خدمت فن اور خدمت خلق کے لیے وقف کردیا جو اس وقت تک تنہا ان کی ذاتی ملکیت تھا۔ اسی سال سے انھوں نے اس کی آمدنی کو رفاہی مقاصد کے لیے مخصوص کرکے اپنے سماجی مشاغل میں اضافہ کرنا شروع کردیا جن کا دائرہ روز بہ روز بڑھتا ہی گیا۔ ہمدرد وقف کی آمدنی سے ضعیفوں، بیواؤں کی امداد، طالب علموں کے وظائف اور دینی مدارس کی امداد کے علاوہ ملک کی ذہنی زندگی میں تحرک کے لیے شام ہمدرد کا سلسلہ شروع کیا۔ کراچی کے کسی ایک ماہر، عالم، ادیب، پروفیسر، سائنس داں، قانون داں، معالج کو ہر مہینے اس کے اپنے خاص موضوع پر شہر کے پڑھے لکھے اور ذہین لوگوں کے سامنے اپنے افکار پیش کرنے کے لیے مدعو کیا جاتا تھا۔ پھر کراچی سے بڑھ کر یہ سلسلہ ملک کے تین اور بڑے شہروں یعنی لاہور، راولپنڈی اور پشاور میں بھی شروع ہوگیا۔ اس طرح سوچنے سمجھنے والے طبقے میں باہم ارتباط بھی بڑھا۔ جنوری ۱۹۹۵ء سے شام ہمدرد، شوریٰ ہمدرد میں تبدیل ہوگئی ہے۔ ۲۰۔ ۲۵ شرکاے شوریٰ کسی ایک دانش ور کے افکار و خیالات

سننے کے بجائے کسی مقررہ موضوع پر باہم اظہار خیال اور اختلاف رائے کرتے ہیں۔ یہ ایک طرح کا تھینک ٹینک ہے۔

شام ہمدرد کی مجالس کے علاوہ دانش وروں کے نتائج فکر کو محفوظ کرنے کے لیے حکیم صاحب نے مقالات شام ہمدرد کی تین جلدیں بھی مرتب اور شائع کیں۔

۱۹۵۶ء میں حکیم صاحب نے برادر بزرگ حکیم عبدالحمید کے ساتھ یورپ کے ملکوں کا طویل سفر کیا۔ تقریباً تین ماہ کا یہ سفر محض سیر و سیاحت کے لیے نہیں تھا بلکہ دنیا کو آنکھیں کھول کر دیکھنا بھی تھا۔ ترقی یافتہ ملکوں کے اداروں اور علمی پیش رفتوں کا مطالعہ کرنا بھی تھا۔ حکیم برادران نے یہ بھی سمجھنا چاہا کہ طب کی ترقی کس رخ پر جارہی ہے۔ ریسرچ اور دوا سازی کن منازل سے گزر رہی ہے۔ اس کے بعد حکیم صاحب نے اپنا پہلا سفرنامہ "یورپ نامہ" لکھا۔ جلد ہی دوسرا سفرنامہ "جرمنی نامہ" بھی شائع ہوا۔ پھر ایک خاصے طویل وقفے کے بعد پے در پے دس مزید سفرنامے آئے۔ حکیم صاحب سفر بھی زیادہ کرنے لگے تھے۔ انھوں نے تمام براعظموں کے تمام اہم شہروں کے سفر کیے۔ یہ سفر علمی مقاصد کے لیے ہوتے تھے، کانفرنسوں میں شرکت کے لیے یا مقالے پڑھنے یا لکچر دینے کے لیے۔

زندگی کے آخری عشرے میں حکیم صاحب کو بچوں کے ادب سے زیادہ دل چسپی ہوگئی۔ ایک مستقل شعبہ بچوں کے ادب کی اشاعت کے لیے قائم کیا۔ خود بھی کتابیں لکھیں جن کی تعداد سو سے اوپر ہوگئی۔ ان میں بچوں اور نوجوانوں کے لیے ۴۷ سفر نامے شامل ہیں۔

حکیم صاحب نے انگریزی میں بھی لکھا ہے۔ ان کی اردو، انگریزی کی کل تصانیف کی تعداد دو سو سے زیادہ ہوجاتی ہے۔ رسائل کو بھی ان کا ذہن پوری اہمیت دیتا تھا۔ خود کئی رسائل شائع کرتے تھے۔ رسالہ "ہمدرد صحت" تو ہندستان ہی سے ساتھ لائے تھے اور اس کی ادارت میں ان کے برادر حکیم عبد الحمید صاحب نے ۱۹۳۹ء سے ان کا نام شامل کرلیا تھا۔ "ہمدرد نونہال" ۱۹۵۳ء میں بچوں کے لیے کراچی سے جاری کیا تھا۔ اس کی ادارت میرے سپرد کردی تھی، لیکن اس کی ترقی و اشاعت میں پوری دل چسپی لیتے تھے۔ اس کے لیے ایک مستقل کالم "جاگو جگاؤ" کے علاوہ کبھی کبھی

دوسرے مضامین بھی لکھتے تھے۔ اطبا کے لیے ایک ماہنامہ "اخبار الطب" بھی برسوں تک نکالتے رہے۔ طب پر ایک انگریزی ماہنامہ "ہمدرد میڈیکل ڈائجسٹ" بھی شائع کرتے تھے جو اب عرصے سے "ہمدرد میڈکس" کے نام سے سہ ماہی نکل رہا ہے۔ دینی، علمی مضامین کے لیے ایک سہ ماہی جرنل "ہمدرد اسلامیکس" بھی جاری ہے جس میں بیرونی اصحاب علم کے مضامین بھی شائع ہوتے ہیں۔

ملک کے علمی، ادبی رسائل کی اشاعت میں بھی دل چسپی لیتے تھے اور ان سے تعاون کرتے تھے۔ قومی زبان کی ترقی و ترویج ہمیشہ حکیم صاحب کے پیش نظر رہی۔ خود بھی بنیادی طور پر اردو ہی کے لکھنے والے تھے۔ ہمدرد کی دفتری زبان بھی اردو ہی ہے۔ حکیم صاحب دفتری اور انتظامی ہدایات اردو ہی میں لکھتے تھے۔ خط و کتابت بھی اردو ہی میں کرتے تھے، صرف بیرونی ممالک سے مراسلت انگریزی میں کرتے تھے۔ خط کا جواب دینا لازمی تھا۔ حکیم صاحب کے لکھے ہوئے خطوں کی تعداد ہزاروں میں ہے۔

انتہائی مصروفیت کے باوجود ادیبوں، شاعروں اور ہر شعبے کے اہل علم سے میل ملاقات میں بہت سوں سے آگے تھے۔ کبھی کبھی کسی رسالے میں کوئی مضمون پڑھ کر مضمون نگار یا مدیر کو اپنے تاثرات بھی لکھ بھیجتے تھے۔ اہل علم وادب کا علاج بھی بڑی محبت سے کرتے تھے۔

اردو کے فروغ کے سلسلے میں ایک اہم خدمت "پیامی" کا اجرا ہے جو "یونیسکو کوریئر" کا اردو ایڈیشن تھا۔ اس کی ادارت میں مجھے بھی شرکت کی مسرت حاصل ہے۔ حکیم صاحب نے بڑی جدوجہد کے بعد اس کو یونیسکو ہیڈ کوارٹر، پیرس سے منظور کرایا تھا۔ تعلیم، سائنس اور ثقافت کے موضوعات پر اس رسالے کے مضامین عالمی معیار کے ہوتے تھے۔ ان کے مطالعے سے معلوم ہوتا تھا کہ دنیا کو کیسے کیسے مسائل در پیش ہیں۔ ان کا حل تو بڑی بات ہے، ان کی باریکیوں اور پیچیدگیوں کا بھی ہمیں علم نہیں۔ ۱۹۷۷ء سے ۱۹۹۰ء تک ۱۴ سال یہ علمی عالمی ماہنامہ پوری پابندی اور باقاعدگی سے شائع ہوتا رہا، لیکن چوں کہ یونیسکو کے حوالے سے حکومت کا بھی دخل ہوتا ہے، اس لیے وزارت تعلیم نے "پیامی" کی اشاعت کی ذمے داری ہمدرد سے لے کر ایک یونی ورسٹی کو دے دی جو صرف سال ڈیڑھ سال ہی اس کی اشاعت جاری رکھ

سکی۔

کتابوں سے حکیم محمد سعید شہید کی دل چسپی کا ایک اظہار تو بیت الحکمت (لائبریری) کا قیام اور اس کے لیے خوب صورت وسیع و عریض عمارت کی تعمیر ہے۔ اس لائبریری میں طبی و دینی موضوعات کے علاوہ مختلف موضوعات پر بڑی تعداد میں کتابیں ہیں۔ حکیم صاحب کی ایک تالیف "کتابوں کی کتاب" بھی ان کی کتاب دوستی کا اظہار ہے۔ اس میں ۴۲۵ کتابوں کے بارے میں حکیم صاحب کی تقریریں، تحریریں اور تاثرات شامل ہیں۔ حکیم صاحب کی منتشر تحریروں کو جمع اور مرتب کرکے میں نے ۱۹۹۵ء میں یہ کتاب شائع کی تھی۔

ادب دوستی اور اہل قلم کی قدر دانی کا اظہار اس سے بھی ہوتا ہے کہ ۱۹۹۴ء میں حکیم صاحب نے چاروں شہروں کی شام ہمدرد کو ادیبوں، شاعروں کو وثیقۂ اعتراف پیش کرنے کے لیے مختص کیا اور پورے سال یہ سلسلہ جاری رہا۔ وثیقۂ اعتراف کی شیلڈ پیش کرنے سے پہلے اس ادیب یا شاعر کے بارے میں دوسرے ادبا مقالے پڑھتے تھے، پھر کسی اہم ادبی شخصیت کے ہاتھ سے وہ شیلڈ پیش کرائی جاتی تھی۔

حکیم محمد سعید نے صحت عامہ اور ادبی و علمی خدمات کے علاوہ تعلیم کے میدان میں فعال کردار ادا کیا۔ ۱۹۵۸ء میں انھوں نے "جامعہ طبیہ شرقیہ" کے نام سے طب کی تعلیم کے لیے ایک معیاری کالج قائم کیا۔ یہ کالج ہزاروں اطبا پیدا کرچکا ہے جو کاروان طب ہمدرد کو رواں دواں رکھے ہوئے ہیں۔ اب اس کالج نے ہمدرد یونی ورسٹی کے تحت ڈگری کالج کی حیثیت اختیار کرلی ہے اور اس کا نام ہمدرد المجید کالج آف ایسٹرن میڈیسن ہوگیا ہے۔

بچوں کی معیاری تعلیم کے لیے ۱۹۹۰ء میں ہمدرد پبلک اسکول قائم کیا جو ملک کے چند ممتاز اسکولوں میں شمار ہوتا ہے اور اب اسی میں بارھویں جماعت تک تعلیم ہوتی ہے۔

ہمدرد یونی ورسٹی کا قیام حکیم صاحب کا ایک تاریخی کارنامہ ہے۔ نجی شعبے میں کئی اہم فیکلٹیز اور کالجوں پر مشتمل ایک باقاعدہ یونی ورسٹی کا قیام آسان نہیں تھا۔ اس کے لیے سرمائے کے علاوہ جامع منصوبہ بندی کی بھی ضرورت تھی اور حکیم

صاحب میں فکر و عمل کا بڑا اچھا امتزاج تھا۔ وہ راہ کی مشکلات کو ذہن پر حاوی نہیں ہونے دیتے تھے۔ وہ قدم بڑھاتے تھے تو راستہ خود ہموار ہوجاتا تھا۔

حکیم صاحب کی ثقافتی سرگرمیوں میں بعض اہم قومی اور بین الاقوامی کانفرنسوں کا انعقاد بھی شامل ہے۔ کئی سال "صحت ملی کانفرنس" کے عنوان سے شعور صحت بیدار کرنے کے لیے کانفرنسیں منعقد کرتے رہے۔ عظیم مسلمان سائنس دانوں میں ابن الہیثم اور البیرونی کے ہزار سالہ جشنوں کا اہتمام بھی کیا' جن میں کئی مشرقی و مغربی ملکوں سے ماہرین اور مستشرقین نے شرکت کی اور ان مسلم حکما کے تاریخ ساز کارناموں کو روشنی میں لائے۔ پھر حکیم صاحب نے ان کانفرنسوں کے مقالات بھی مرتب اور شائع کیے۔ تین سال تک حکیم صاحب نے بڑے پیمانے پر سیرت کانفرنسیں منعقد کیں اور ان کے مقالات مرتب اور شائع کیے۔

حکیم صاحب نے نہ کبھی شاعری کی اور نہ افسانے لکھے' اس لیے وہ اس معنی میں ادب کے آدمی نہیں تھے' لیکن ادب کا مطالعہ کرتے تھے اور کبھی ادب کے موضوعات خصوصاً ادبی' علمی شخصیات اور کتابوں پر مضامین لکھتے تھے یا کسی ادبی تقریب میں مقالہ پڑھتے تھے۔ ایسے مقالات بہت منتشر تھے۔ کئی تحریریں تو فائلوں میں مدفون تھیں۔ خیال ہوا کہ ان کو ضائع ہونے سے بچانا چاہیے اور تلاش کر کے کتابی صورت میں مرتب کرنا چاہیے۔ چناں چہ یہ کتاب "ادبی مقالات سعید" اسی کوشش میں وجود میں آئی ہے۔ رفیق مکرم ڈاکٹر سید فرحت حسین کے تعاون سے یہ کام آسان ہوگیا اور یہ مفید اور اہم کتاب مکمل ہوسکی۔

زبان

دنیا بھر کے گنجینۂ علم و حکمت میں اگر آپ کوئی قدر مشترک ڈھونڈنا چاہیں تو اس تلاش و جستجو میں نمایاں ترین قدر آپ کو یہ ملے گی کہ اظہار و بیان کی صفت انسان کا شرف بھی ہے اور ذریعہ شرف بھی۔ تمام جان دار مخلوق میں صرف اسی میں یہ صفت عظیم پائی جاتی ہے کہ اس نے اپنے ابنائے جنس کے ساتھ کثیرالجہت رابطوں کو تہذیب و تمدن کا چمن زار بنا دیا۔ حکما نے اسے حیوان ناطق، حیوان عاقل اور حیوان عمرانی کے مختلف نام دیے ہیں، لیکن ان سب کی تہ میں ایک ہی حقیقت کا عرفان و اقرار پنہاں ہے کہ انسان میں بولنے اور لکھنے کی حیرت انگیز صلاحیت موجود ہے۔ یہ صلاحیت بالکل منفرد، انتہائی لچک دار اور قوس و قزح کی طرح رنگ برنگی اور حسین ہے۔ بلاشبہ انسان کو لسانی قدرت و کمال راتوں رات ایک اچانک عطیے کے طور پر نہیں ملا ہے۔ اس کے حصول کی خاطر اسے خاصا طویل سفر طے کرنا پڑا ہے، لیکن صبر آزما مشقتوں سے گزر کر اس نے جو صلہ پایا ہے، وہ اس کی ہزاروں سال کی انتھک محنت کا بھرپور اور بہترین نتیجہ ہے۔

ایک لمحے کے لیے ذرا چشم تصور سے اپنے گرد و پیش پر نگاہ ڈالیے اور غور کیجیے کہ کیا حیات انسانی میں کوئی پہلو ایسا بھی ہے جس میں نمود و ارتقا کو اظہار کا سہارا نہ لینا پڑتا ہو؟ یقیناً آپ کے سامنے نفی میں جواب ابھرے گا اور اطمینان و استحسان کے ساتھ آپ کے اندر اس اعتراف کا جذبہ تازہ پیدا ہوگا کہ علم و حکمت، شعر و سخن اور ادب و ثقافت کی ساری بہار زبان کی رہین منت ہے۔ زبان کو درمیان سے ہٹا دیجیے تو دفعتہً ایک ہی جست میں انسان غاروں کی وحشت ناک تاریکیوں کی طرف پلٹ جائے گا۔ زبان کی اس قدر بے مثل اہمیت کے باوجود آج تک ایسے کسی ایک بھی صاحب فکر کی

نشان دہی نہیں کی جاسکی جس نے زبان کو ایک ناگزیر ذریعے کے بجائے اسے فی نفسہٖ ایک مقصود بالذات کا درجہ دیا ہو۔ اس بین حقیقت کے دونوں پہلوؤں پر یکساں نظر رہے تو اس افراط و تفریط سے دامن بچایا جاسکتا ہے جو اکثر و بیشتر زبان کے بارے میں غلط رویے کا سبب بنتی ہے۔

مغرب کے جدید تصور قومیت میں زبان کو اہم مقام حاصل ہے۔ زبان انسانوں کے کسی گروہ کو یک جا اور منظم کرنے میں حیرت انگیز کردار ادا کرتی ہے۔ زبان کو عصبیت کا مظہر اور نفرت کا نشان بنا دینا' اس کے اصل اور اعلا مقصد کی نفی کے مترادف ہے۔ قرآن حکیم نے برادریوں و قبائل کی تقسیم اور نسلوں و قوموں کے فرق کو جس طرح محض پہچان کا ذریعہ بتایا ہے اسی طرح اس نے لون و لسان کے فرق کو آیات اللہ کا ایک حصہ قرار دیا ہے۔ اس کے برعکس اگر انھیں کچھ اور سمجھا جاتا ہے تو وہ سب اس وحدت آدم کی خلاف ورزی ہے جو تصور توحید کے تحت کرۂ ارض پر قائم کرنی مقصود ہے۔ اگر انسانی معاشرے میں زبان کا کردار اس مرکزی مقصد کے ماتحت نہ رہے تو وہ نعمت ثابت ہونے کے بجائے فتنہ و فساد کا موجب بنتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خلاف وحدت' خلاف اسلام اور انسان دشمن قوتیں زبان کو ایسے آلۂ کار کے طور پر استعمال کرتی ہیں جس سے بڑی ہوشیاری کے ساتھ تخریبی کام لیا جاتا ہے۔

قیام پاکستان کے فوراً بعد ان قوتوں نے ہمارے ملک میں سر اٹھایا' کیوں کہ انھیں یہ خطرہ تھا کہ اگر کہیں یہاں وحدت دین و ملک کے ساتھ ساتھ وحدت زبان کی کیفیت بھی پیدا ہوگئی تو اسلام اس خطے میں ایسا مینارۂ نور بن جائے گا جس کی روشنی پوری دنیا کو منور کردے گی۔ اسی خطرے کے پیش نظر پاکستان میں زبان کے مسئلے کو پیچ در پیچ الجھا کر رکھ دیا گیا۔ کہیں بنگالی کو اردو کے مقابلے میں قومی زبان کی دعوے دار کے طور پر کھڑا کیا گیا' کہیں لوک ادب کے حسین نام پر سندھی' پنجابی' پشتو اور بلوچی کی اتنی شدت وکثرت سے حوصلہ افزائی کی گئی کہ وہ ملک کا اولین مسئلہ نظر آنے لگیں اور کہیں انگریزی کی تہذیبی آغوش میں پلی ہوئی نوکر شاہی نے ہزار حیلوں کے ساتھ انگریزی زبان کو پاکستان کی بقا و ترقی کے لیے لازمی قرار دیا۔ ساری توانائیوں کو اس طرح انتشار کے عناصر کی نذر کردینے کے بعد باقی جو کچھ بچا وہ اردو کے حصے میں آیا۔

وہ باقی کیا ہے؟ وہ ہے کبھی کبھی یہ لفظی اعتراف کہ اردو ہماری قومی زبان ہے اور "مقتدرہ قومی زبان" کا قیام۔ بنگالی زبان پر اٹھایا ہوا طوفان تو بالآخر مشرقی پاکستان کو بہا کر ہی لے گیا۔ لوک ادب کے پردے میں صوبائی اور علاقائی زبانوں کو جن اغراض و مقاصد کی خاطر بڑھایا چڑھایا جاتا ہے ان کے جان دار مظاہر بھی سامنے آتے رہتے ہیں۔ حال آنکہ علاقائی زبانوں کا قومی زبان سے کوئی ٹکراؤ نہیں ہے۔ ان کی ترقی کے لیے مثبت کام ہونا چاہیے۔

انگریزیت کتابوں اور کالجوں سے نکل کر ٹی وی، کیسٹ اور "پاپ" کے سہارے صرف دفتروں کی کارروائی، دکانوں کے ناموں اور بسوں کے نمبروں ہی تک محدود نہیں رہی، بلکہ اس نے ہمارے پورے شہری معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ یہ جمہوریہ اسلامیہ پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد کی بات ہے کہ شہروں میں ماں "ممی" اور ابو "ڈیڈی" بنے۔ سرکاری ذرائع ابلاغ پر "ذہنی آزمائش" تک کے پروگراموں میں سن و سال کا اظہار انگریزی زبان میں بلا روک ٹوک ہوتا ہے۔

یہ اس ہول ناک حشر کی ہلکی سی جھلک ہے جو ہماری قومی زبان کا ہو رہا ہے۔ کاش کسی قیامت کی گھڑی آنے سے پہلے ہم یہ سوچ سکیں کہ ہماری معاشرت کے یہ عنوانات فریب نظر ہیں۔ ان کا نتیجہ خودی کی موت ہے۔ ذوق زندگی عزیز ہے تو ان حالات کو بدل ڈالیے جو خودی کا گلا گھونٹ رہے ہیں۔ باہمی یگانگت کی راہوں کو استوار کیجیے۔ ان راہوں میں اپنی زبان سے اور اردو سے محبت کی راہ پیش پیش ہے۔ یہ راہ ہمیں پاکستان اور اسلام سے محبت کی شاہ راہ سے ملاتی ہے۔

قومی زبان کی اہمیت

مقتدرۂ قومی زبان جس احتیاط، مگر جس شدومد کے ساتھ اختیار قومی زبان کے باب میں پیش رفت کر رہی ہے اس کا وزن اب عام طور پر محسوس کیا جارہا ہے۔ پاکستان میں اختیار و اقتدار قومی زبان کے لیے راہوں کو ہموار کرنا بے حد ضروری ہے اور اس کے لیے مقتدرہ نے رہنما کتب کی اشاعت کے تواتر و تسلسل کو جو اہمیت دی ہے وہ ناگزیر، قابل قدر اور لائق تحسین ہے۔ جناب محترم ڈاکٹر وحید قریشی صاحب اور ان کے تمام رفقا بڑے جذب و انہماک کے ساتھ مصروف عمل ہیں اور مجھے واقعی بڑی حیرت ہے کہ کسی "بقراط" نے اب تک ان کی راہوں کو مسدود کیوں نہیں کیا ہے یا شاید بات یوں ہے کہ مقتدرہ کے پرجوش اور پرخلوص ارکان کی لگن اور محنت نے کسی رکاوٹ کو خاطر میں نہ لانے کا عزم کر لیا ہے اور مجھے خوشی ہے کہ اس کے اثرات ظاہر ہونے لگے ہیں۔ اجتماعی زندگی کے مختلف شعبوں میں اور دفتری نظام کے بعض گوشوں میں اردو زبان کا جلوہ کہیں کہیں نظر آنے لگا ہے۔ اب آپ اس کو یوں کہیے کہ وزارتوں کے بقراط قومی زبان کی اہمیت کے کچھ قائل ہوتے جارہے ہیں یا پھر یہ سمجھ لیجیے کہ اب مخالفت کی آب و تاب کچھ کم ہوگئی ہے۔ امید افزا بات یہ ہے کہ قافلے کا رخ منزل کی سمت ہے۔

میں اس محفل میں شرکت کا موقع دیے جانے پر منتظمین، خصوصاً محترمہ ادا جعفری کا شکر گزار ہوں۔ فاضل مقررین نے اپنے اپنے انداز میں قومی زبان کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے اور مختلف پہلوؤں کو واضح فرما دیا ہے۔ میں نہایت اختصار کے ساتھ مسئلے کے بعض پہلوؤں پر انعطاف توجہ چاہوں گا۔

اقوام و ملل کی زندگی کی تشکیل اور ان کے اجتماعی وجود اور تشخص کی تعیین میں جو

عوامل اور جو عناصر حصے دار ہوتے ہیں' ان میں قومی زبان کو ایک مستقل مقام حاصل ہوتا ہے۔ قومی زبان محض اقوام و امم کے تاریخی وجود ہی کو تحفظ نہیں بخشتی' بلکہ ان کے علمی' تہذیبی اور ثقافتی وجود کو دوام بھی عطا کرتی ہے۔ تاریخ شاید ہی اس امر سے انکار کر سکے کہ جن اقوام و امم نے اور جن ملتوں نے اپنے تشخص کی علامت اپنی قومی زبان کو قرار دیا ہے انھوں نے انسانی تمدن کی تاریخ میں اپنے بلند مقام کا انتخاب خود ہی کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ زبان کا کردار صرف دائرۂ ابلاغ تک ہی محدود نہیں ہوتا' بلکہ تعمیر و تشکیل کے ہمہ جہت وسائل میں بھی اسے مرکزیت حاصل ہوتی ہے۔ اس کے دائرۂ عمل میں شان دار روایات کا جذب و انجذاب' تدریس علوم' تشکیل فکر و نظر' تحقیق علم و فن' شرح و اظہار اور وسیع معنویت رکھنے والی اصلاح و انقلاب کی تحریک بھی شامل ہوتی ہے۔ اس بات سے انکار کی کوئی صورت قابل فہم نہیں ہے کہ کوئی تحریک اس وقت تک تاریخ ساز مقام کی رفعتوں سے ہم کنار نہیں ہو سکتی جب تک قومی زبان اس کی ترجمان نہ ہو۔

سلسلۂ رسالت و نبوت پر غور کیجیے تو قومی زندگی میں قومی زبان کی اہمیت کی واضح تصویر سامنے آجائے گی۔ قرآن ناطق ہے :

وما ارسلنا من رسول الا بلسان قومه ليبين لهم (ابراہیم : ۴)

(ہم نے اپنا پیغام دینے کے لیے جب کبھی کوئی رسول بھیجا ہے اس نے اپنی قوم ہی کی زبان میں پیغام دیا ہے تاکہ وہ انھیں اچھی طرح کھول کر بات سمجھائے۔)

اللہ تعالیٰ کی طرف سے مبعوث ہونے والے انبیائے کرامؑ نے ہمیشہ قانون الٰہی کے مطابق قومی زبان ہی کو وسیلۂ ابلاغ و اظہار کی حیثیت سے اختیار فرمایا اور اس سے اپنا رشتہ برابر قائم رکھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت و بعثت عالمی ہے۔ اس ہمہ گیری کے باوصف عرب کی قومی زبان ہی وحی الٰہی بنی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بھی اظہار وخطاب کا شرف قومی زبان "عربی مبین" ہی کو حاصل ہوا۔ یہ سوال کبھی کسی کے ذہن میں نہ آیا کہ جو پیغام عالم گیر ہے وہ ایک مخصوص قومی زبان میں کیوں ہے؟ اس لیے کہ یہ بات آفاقی صداقت کے طور پر تسلیم کی جاچکی ہے کہ ایک قوم جب کسی حقیقت کا مکمل شعور و ادراک حاصل کرلیتی ہے تو وہ فکر و نظر کے سانچوں میں ڈھل کر

خود شعلۂ انقلاب بن جاتی ہے یعنی اساسی چیز ادراک و شعور اور حقیقی عرفان و آگہی ہے جو قومی زبان کے بغیر حاصل نہیں ہوتی۔

علم و فنون ہوں یا حکمت و دانش کے گہرہائے آب دار، صنعت اور ٹکنالوجی ہو یا سائنسی تحقیق و تجزیات، سب کا انحصار اس بات پر ہے کہ پہلے ان کے اصول و کلیات تک رسائی حاصل ہو۔ یہ اسی وقت ممکن ہے کہ جب تدریس سے لے کر قومی زندگی کے تمام شعبوں میں ہم قومی زبان کو ذریعۂ اظہار وابلاغ سمجھ کر اختیار کریں۔ اگر عشق و محبت کی دنیا میں "زبان غیر میں شرح آرزو" ممکن نہیں ہے تو قوموں کی زندگی میں قومی زبان کے بغیر عالمی و علمی ترقی کی دولت سے ہم کنار ہونا اور اس جدوجہد میں اپنے تشخص کے ساتھ نمایاں کردار ادا کرنا بھی ممکن نہیں ہے۔ اس حقیقت پر مذہب، تاریخ، فلسفہ اور سائنس سب نے مہر توثیق ثبت کی ہے۔

قومی زبان کے کردار پر یوں تو خاصے تعمق، گہرائی اور گیرائی کے ساتھ تدریس اور تشخص کے حوالے سے روشنی ڈالی گئی ہے اور سارے حقائق اپنی جگہ پر اہم ہیں، لیکن یہ اہم نکتہ بھی ہمارے ذہن میں رہنا چاہیے کہ اس کا تعلق بڑی حد تک ہمارے اجتماعی اخلاق اور قومی کردار سے ہے۔ جس قوم کی عملی زندگی میں اس کی قومی زبان کو اثر و نفوذ حاصل نہ ہو اور وہ حقائق کے ادراک و اظہار میں دوسری قوموں کی دست نگر ہونے کو المیہ نہ سمجھتی ہو، اس کے گدایانہ مزاج اور اس کی شکست خوردہ اور مرعوب ذہنیت پر نوحہ و ماتم کے سوا اور کیا کیا جاسکتا ہے۔

یہ ہماری قومی زندگی کا عجیب و غریب سانحہ ہے کہ ہم اپنے تشخص کے دعوے کے باوجود اور اپنی قومی زبان کے مایۂ ناز اور ترقی یافتہ ذخیرے کے باوصف اس کے نفاذ کی موثر جدوجہد سے اب تک قاصر ہیں۔ اس صورت حال نے نہ صرف ہماری شناخت کو مبہم کر دیا ہے، بلکہ ہم سے قومی شعور بھی سلب کر لیا ہے اور اس وحدت کو بھی نذر انتشار کر دیا ہے جو قومی زبان کے ذریعے سے ہی برقرار رہ سکتی ہے۔

آج قوم تو ہے، مگر قومی زبان اب تک اپنے مکمل نفاذ کی راہ دیکھ رہی ہے۔

قومی زبان کا مسئلہ

میں دیکھ رہا ہوں کہ اس محفل میں ہر طرف صاحبان علم و دانش جمع ہیں۔ایسی وقیع و معتبر مجلس میں مجھ جیسے آدمی کا شامل ہونا ہی بڑے اعزاز و اکرام اور سعادت کی بات تھی چہ جائیکہ مقتدرہ کے صاحبان حل و عقد نے مجھے اس واجب التکریم جلسے کی صدارت کی عزت سے بھی نوازا ہے۔ میں تمام اراکین مقتدرہ کا تہ دل سے شکر گزار ہوں۔ بالخصوص ملک کے نامور ادیب' ماہر تعلیم اور صاحب نظر دانشور ڈاکٹر وحید قریشی بطور خاص میرے جذبات شکر و سپاس کے مستحق ہیں کہ ان کی توجہ میرے لیے ہمیشہ باعث تقویت و اطمینان رہی ہے۔ ڈاکٹر صاحب محترم نے اپنی زندگی علم اور تشنگان علم کی پیاس بجھانے کے لیے وقف کر رکھی ہے۔ ہمارے ملک میں ایسے کتنے آدمی ہیں جن کا اوڑھنا بچھونا ہی علم و ادب ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف لائق صد تحسین ہیں کہ آپ کا شمار ان ہی چند گنے چنے افراد میں ہوتا ہے۔ اب آپ میرے دل کی تقویت کا اندازہ کیجیے کہ ایسے صاحب فضیلت دانشور کی محبت میرے شامل حال ہے۔ میں آپ کی محبت و توجہ کے لیے سراپا شکر و سپاس ہوں اور اپنے جذبات شکر گزاری کے اعلان کو اپنے لیے موجب سعادت و باعث عزت سمجھتا ہوں۔

مقتدرہ قومی زبان ایک ایسا فعال ادارہ ہے کہ جو قومی زبان کی خدمت ایک مقدس فریضہ قرار دے کر انجام دے رہا ہے۔ بلاشبہ زبان اقوام و ملل کی شناخت ہوتی ہے اور ان کے تہذیبی سفر میں منزل پالینے کی قابل قدر ضمانت فراہم کرتی ہے۔ ہم زبان ہی کے وسیلے سے اپنی ذات کا اظہار کرتے ہیں اور تفہیم کائنات کے لیے نئے دروازے کھولتے ہیں۔ قومی زبان قوموں کے جوہر باطنی کی ترجمان اور ان کے اجتماعی تجربے کی امین ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی ہر قوم اپنی زبان کو اپنا اہم ترین سرمایہ سمجھتی ہے۔

اس حقیقت کی روشنی میں ہمیں یہ غور کرنا چاہیے کہ ہم نے پاکستان میں اپنی قومی زبان اردو کے لیے کس انداز سے غور کیا ہے اور کس طور پیش رفت کی ہے۔ کہا جاتا ہے اور صحیح کہا جاتا ہے کہ بے توجہی کا سب سے بڑا سبب انگریزوں کی حکومت تھی جنھوں نے اپنی مصلحتوں کے پیش نظر انگریزی زبان کو دفتری زبان کے طور پر رائج کیا۔ چناں چہ اس زبان کا سیکھنا یہاں کے لوگوں کے لیے لازمی ٹھیرا' لیکن آزادی کے بعد غیر زبان کی گرفت سے آزادی حاصل نہ کرنا یقیناً قابل توجہ اور لائق فکر ہے۔

زبان کے سلسلے میں یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ جہاں کوئی زبان آتی ہے تو وہ تنہا نہیں آتی' بلکہ اپنے ساتھ مخصوص انداز فکر اور تہذیب و تمدن کے نئے اسلوب بھی لاتی ہے۔ چناں چہ انگریزی زبان کے ساتھ ہم پر بھی واضح طور پر مغربی تہذیب و تمدن کا اثر ہوا اور حاکم قوم کے انداز نے ہم محکوموں کے فکر و نظر پر بھی غلبہ حاصل کیا۔ اس حقیقت کی ترجمانی خود ہماری زبان کے ایک محاورے "جیسا راجا ویسی پرجا" سے ہوتی ہے۔ ہم نے انگریز کے دور حکومت میں پرجا کی حیثیت سے راجا کا اتباع کیا۔ اس سے ہماری اپنی تہذیب و معاشرت کو جو نقصان اور صدمہ پہنچا اس کی داستان بہت طویل ہے۔

اصل مسئلہ یہ ہے کہ آزادی کے بعد ہم اپنی قومی زبان کے باب میں ابھی تک مثبت پیش رفت کیوں نہیں کر سکے ہیں؟ اگر گہرائی میں جاکر غور کیا جائے تو یہ فقط لسانی مسئلہ نہیں ہے' بلکہ یہ ایک تہذیبی و تمدنی اور ثقافتی مسئلہ بھی ہے اور سب سے زیادہ یہ کہ یہ ایک نفسیاتی مسئلہ ہے جس کو ذہنی و فکری مرعوبیت نے جنم دیا ہے اور جس نے تہذیبی' ثقافتی اور سیاسی شکست و ریخت کی فضا میں پرورش پائی ہے اور جسے ملک و ملت سے عدم محبت' سربلندی و سرفرازی سے بے اعتنائی اور خودی و خود داری سے لاتعلقی نے درازی عمر عطا کی ہے۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ پاکستان میں مختلف علاقائی زبانیں بولی جاتی ہیں جس کی وجہ سے قومی زبان کا مسئلہ لاینحل رہا ہے۔ میرے نزدیک یہ بات بہت بڑی غلط فہمی پر مبنی ہے۔ دنیا میں کئی ملک ہیں کہ جہاں ایک سے زیادہ زبانیں بولی جاتی ہیں' لیکن ان تمام ممالک کی ایک قومی زبان ہے جو اجتماعی طور پر اس ملک اور قوم کی شناخت سمجھی جاتی

ہے۔ مثال کے طور پر روس کو لیجیے کہ جہاں فارسی، ترکی اور روسی، کئی زبانیں رائج ہیں، لیکن ان کی قومی زبان روسی ہے۔ جہاں تک روس کی مختلف زبانوں کا تعلق ہے ان کی تو اصل بھی الگ الگ ہے اور ان زبانوں کے پس پشت تاریخ و تہذیب میں بھی زبردست اختلاف ہے، لیکن ان سب دشواریوں کے باوجود انھوں نے ایک ملاپ کو قابل عمل بنا لیا ہے۔ اس حقیقت کے برعکس پاکستان کی تمام علاقائی زبانوں کی اصل بھی ایک ہے اور ان کا تہذیبی و تاریخی پس منظر بھی ایک ہے۔ اس کا ایک ثبوت تو یہ ہے کہ پاکستان کی تمام علاقائی زبانوں کا رسم الخط بنیادی طور پر ایک ہے۔ ہم اس کو عربی رسم الخط کہہ سکتے ہیں۔ مختلف علاقائی زبانوں میں مشترک الفاظ کی تعداد اس کثرت سے ہے کہ ان کو کسی طرح بھی ایک دوسرے سے مختلف قبیل کی زبان نہیں کہا جاسکتا۔ اب علاقائی ماحول کی وجہ سے ان زبانوں میں جو فروعی اختلافات ہیں ان کو تسلیم کرنا اور ان کا احترام کرنا بھی فرض ہے۔ اگر ہم یہ لسانی فریضہ صحت و سلامتی کے ساتھ انجام دیتے رہیں اور ہر علاقائی زبان کو اس کے فروغ اور ترقی کے مواقع فراہم کرتے رہیں تو ایک دوسرے سے غیریت ختم ہو سکتی ہے۔ زبانوں کا مقصد انسانوں کو قریب کرنا ہوتا ہے، ان کے درمیان بعد پیدا کرنا نہیں۔ زبان تعصب کا نہیں، محبت کا وسیلہ ہے۔ پاکستان کی تمام علاقائی زبانیں محبت کا لازوال خزانہ ہیں اور انھیں اپنے طور پر بڑھنے، پھیلنے اور ترقی کرنے کا حق ہے، لیکن اس حق کو ایک قومی زبان کی ترقی و ارتقا کی راہ میں کسی طرح بھی مزاحم نہیں ہونا چاہیے۔ قومی اور علاقائی زبانوں کو ایک دوسرے کی حریف سمجھنے کے بجائے ایک دوسرے کی حلیف سمجھنے کا شعور پیدا کرنا چاہیے۔ مجھے خوشی ہے کہ مقتدرہ قومی زبان کشادہ نظری سے کام لے رہا ہے۔ یہ کشادہ نظری شعور کامل پیدا کرنے پر منتج ہونی چاہیے۔

آج کی اس تقریب کا عنوان نمائش کتب مقتدرہ قومی زبان ہے۔ میں اس نمائش میں ڈر ڈر کر آیا ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ ہماری قومی زندگی میں نمائش نے افسوس ناک، بلکہ خطرناک حد تک مقام حاصل کیا ہے۔ ہم کام کم کرتے ہیں، نمائشیں زیادہ کرتے ہیں۔ ہم بولتے زیادہ ہیں، عمل کم کرتے ہیں اور جب کام بالکل نہیں کرتے تو نمائش کا زور بڑھ جاتا ہے۔ ہم ہر اس کام کا تہیہ کرتے ہیں جو ہم بالکل کرنا نہیں چاہتے۔ اردو زبان ہی کو

لیجیے۔ اردو کو قومی زبان کی حیثیت سے ہر جگہ اور ہر سطح پر اختیار کرنے میں ہم نے جس شدومد کے ساتھ اظہار خیال کیا ہے اور جس عزیمت کے ساتھ بیانات دیے ہیں اور جس رفعت کے ساتھ دعاوی کیے ہیں اگر ارباب مقتدرہ سارے "نمائشی لٹریچر" کو جمع کر کے شائع کر دیں تو کئی جلدوں میں یہ داستان کم دل چسپ نہیں ہوگی!

بات کہاں سے کہاں جا پہنچی۔ میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ زبان و کتاب لازم و ملزوم ہیں۔ خواہ وہ علاقائی زبان ہو یا قومی زبان، سب ہی ہماری اجتماعی امنگوں کی آئینہ دار ہیں۔ ان زبانوں میں لکھی ہوئی کتابیں ہمارا تہذیبی سرمایہ ہیں۔ وہ شاہ جو رسالو ہو یا رحمان بابا اور خوشحال خاں خٹک کا کلام، بلھے شاہ کی شاعری ہو یا خواجہ فرید کی کافیاں، علامہ اقبال کی تصانیف ہوں یا دوسرے ادیبوں کی تخلیقات، سب ہی ہمارا قومی سرمایہ ہیں اور ہمیں ان سب سے استفادہ کرنا چاہیے۔ کتابوں کی اشاعت ہمارے شعور میں بالیدگی پیدا کرتی ہے جو آخر کار ہمارے قومی استحکام پر منتج ہوتی ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کی رہنمائی میں مقتدرہ قومی زبان نے زبانی جمع خرچ سے گریز کیا ہے اور عمل کی دنیا میں بڑے جماؤ اور پورے وزن کے ساتھ قدم رکھا ہے۔ ہر چند کہ ان کے عزم و ارادے کو شکست دینے کے لیے اور ان کا سانس پھلا پھلا دینے کے لیے طاغوتی طاقتیں برسرِ عمل رہی ہیں، مگر ڈاکٹر قریشی کے پائے وزن و استحکام کو کوئی لرزش نہیں ہوئی۔

مقتدرہ نے کتابوں کی اشاعت پر جو خصوصی توجہ کی ہے وہ ہمارے حق میں ایک نیک شگون ہے۔ کتابوں کے انتخاب کے سلسلے میں مقتدرہ کا رویہ ہمیشہ مثبت رہا ہے۔ اس ادارے سے شائع ہونے والی کتابوں میں سے ان کتابوں کی بنیادی اہمیت سے کون انکار کر سکتا ہے جو کتابوں ہی کے سلسلے میں ہماری رہنمائی کرتی ہیں۔ بہت سے لوگ ہیں کہ جو مختلف موضوعات پر کتابیں پڑھنا چاہتے ہیں، لیکن انھیں اس سلسلے میں کتابوں کی تفصیل کا علم نہیں ہوتا۔ چناں چہ مقتدرہ نے کتابیات کے موضوع پر کئی کتابیں شائع کی ہیں جن میں کتابیات اردو مطبوعات، کتابیات قانون، کتابیات قواعد اردو، اردو اصطلاحات سازی، پاکستان کے اردو اخبارات و رسائل، یہ سب ہی کتابیں ہمارے مطالعے کے لیے ضروری کتب سے ہمیں آگاہ کرتی ہیں۔

کتابیات کے علاوہ زبان سے متعلق بنیادی اہمیت کے موضوعات پر مقتدرہ نے بڑے

کام کی کتابیں شائع کی ہیں، مثلاً اصطلاحات بیمہ کاری، املا و رموز اوقاف، کشاف اصطلاحات کتب خانہ، مختصر قانونی اصطلاحات، اردو رسم الخط، کتب لغت کا تحقیقی ولسانی مطالعہ، سائنسی تکنیکی اصطلاحات، دفتری ترکیبات محاورات اور فقرات، کشاف اصطلاحات سیاسیات وغیرہ وغیرہ۔

یہ سب ہی کتابیں بنیادی اہمیت کی کتابیں ہیں۔ اردو زبان کے مکمل نفاذ کے سلسلے میں لوگ یہی عذر پیش کرتے ہیں کہ اس زبان میں مختلف مضامین سے متعلق مناسب اصطلاحات کی کمی ہے۔ یہ بات کبھی صحیح نہیں تھی، آج بھی یہ غلط ہے۔ اصطلاحات کے میدان میں پاکستان کے مختلف اداروں نے قابل داد کام کیا ہے۔ خود مقتدرہ نے مذکورہ بالا کتابیں شائع کر کے اس عذر کو ختم کرنے کی بڑی کام یاب کوشش کی ہے۔ وضع اصطلاحات کے سلسلے میں ہمیں مزید کام کرنے کی ضرورت ہے اور ساتھ ہی اس کی ضرورت ہے کہ اس میدان میں برسرعمل ادارے باہم تعلق پیدا کریں۔ مجھے یقین ہے کہ مقتدرہ کی ان مساعی جمیلہ کے ساتھ اگر ہم ذریعۂ تعلیم اور ملازمتوں کے لیے امتحانات کے لیے ذریعۂ اظہار اردو کو بنا دیں تو قومی زبان کی ترقی کے امکانات اور بھی زیادہ روشن ہو سکتے ہیں۔

اب آخر میں دعا کے ساتھ میں اپنی تقریر کو ختم کرتا ہوں کہ اللہ تبارک و تعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرمائے کہ ہم اپنی قومی زبان کی ترقی کے لیے ہر ممکن کوشش کریں اور ہمارے درمیان غلط فہمیوں کی بنا پر جو اختلافات پیدا ہوگئے ہیں انھیں یکسر بھلا دیں۔

(یکم دسمبر ۱۹۸۶ء۔ اسلام آباد)

نظریاتی استحکام میں اردو کا کردار

یورپ ہو یا امریکا، مشرق وسطیٰ ہو یا افریقہ ہر جگہ مسلمان نوجوانوں میں احیائے دین کا جذبہ بے پناہ قوت کے ساتھ ابھر رہا ہے۔ اب مادی ترقی کی چمک دمک ان کی آنکھوں کو خیرہ کرنے کے بجائے انھیں اس بات پر اکسا رہی ہے کہ وہ مادی منفعت کے ساتھ روحانی سکون بھی حاصل کریں۔ شاید اقبال کی اس دعا کو کہ: "بھٹکے ہوئے آہو کو پھر سوے حرم لے چل" درجۂ قبولیت عطا ہوگیا ہے۔ تمام مسلمان جانتے ہیں کہ اطمینان قلب صرف ذکر اللہ ہی سے میسر آسکتا ہے۔ قلب کا اطمینان نہ ستاروں تک پرواز میں ہے نہ خلاؤں کی تسخیر میں۔ یہ اگر ہے تو صرف اللہ کی یاد میں ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم تمام مسلمانوں کے دلوں میں یہ ایقان مستحکم کر دے۔

اللہ تعالیٰ نے ہمیں پاکستان جیسا شان دار ملک ہماری انھی تمناؤں کے نتیجے میں عطا کیا تھا کہ ہم اس میں اللہ کا کلمہ بلند کریں گے اور اس کے واحد پسندیدہ نظام حیات 'اسلام' کو عملی زندگی میں نافذ کریں گے۔

نظریۂ حیات پر یقین کامل پیدا کرنا قائدین قوم کی ذمے داری ہے، لیکن آج کی دنیا اب اس قدر ترقی کر چکی ہے کہ اس ذمے داری سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ضروری ہے کہ معاشرے کے مختلف طبقات اشتراک عمل کریں اور اپنے اپنے طور پر نظریے کی صداقت اس طرح لوگوں کے دلوں میں اتارنے کی کوشش کریں کہ وہ ایک نظریاتی مملکت میں اپنے فرائض ادا کریں اور مملکت کے نظریات سے اپنی زندگی کو ہم آہنگ بنانے کی کوشش کریں۔

اس سلسلے میں اہل علم اور ارباب قلم کا کردار سب سے زیادہ اہم ہے۔ مثل مشہور ہے کہ قلم کی دھار تلوار کی دھار سے زیادہ تیز ہوتی ہے۔ یہ بات حقیقت پر مبنی ہے۔

تلوار کے ذریعے سے کسی قوم کو مغلوب تو کیا جاسکتا ہے، لیکن اس کے دل و دماغ پر قبضہ نہیں کیا جاسکتا۔ قلم کے ذریعے سے فرد، جماعت یا قوم میں ایسی تبدیلی لائی جاسکتی ہے کہ ان کی **قلب ماہیت** ہو جائے۔ قلم کی اہمیت کا خیال آتے ہی ذہن میں بے ساختہ پہلی وحی کے الفاظ ابھرنے لگتے ہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر آج سے چودہ سو سال قبل جو وحی نازل ہوئی اس میں اللہ تعالیٰ نے کائنات کی تخلیق کا ذکر کیا اور اس کائنات میں انسان کے معرض وجود میں آنے کی جانب اشارہ کیا۔ اس کے بعد یہ فرمایا کہ :

اقرأ و ربک الاکرم ○ الذی علّم بالقلم ○ علّم الانسان مالم یعلم ○

(العلق : ۳،۴،۵)

(پڑھو، اور تمہارا رب بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعے سے علم سکھایا، انسان کو وہ علم دیا جسے وہ نہ جانتا تھا۔)

گویا اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس نے کائنات کو پیدا کیا اور اس کائنات میں سب سے اشرف اور سب سے احسن مخلوق انسان کو پیدا کیا۔ اسے تمام کائنات پر اس طرح فوقیت عطا فرمائی کہ قلم اس کے حوالے کر دیا اور کہہ دیا کہ اب علم و حکمت حاصل کرے اور اس کے ذریعے سے کائنات کی تسخیر عمل میں لائے۔ علم بالقلم کہہ کر اللہ تعالیٰ نے قلم کی اہمیت جتادی اور اہل قلم اور صاحبان علم و ادب کو کائنات کے سنوارنے، تسخیر کرنے اور اسے زیادہ سے زیادہ انسانوں کے لیے مفید بنانے کی ذمے داری سونپ دی۔

معاشرے میں جو ادیب و شاعر ہوتے ہیں وہ بھی اس کی تعمیر یا تخریب کا کام انجام دیتے ہیں۔ وہ ذہن و دماغ کو متاثر کرتے اور انھیں جس راہ پر چاہیں ڈال دیتے ہیں۔ ادیبوں کو معاشرے کے معمار سے تشبیہ دی جاسکتی ہے۔ جس طرح معمار آہستہ آہستہ اینٹوں کو جوڑ کر عمارت تیار کرتا ہے اسی طرح ادیب اپنے اشعار اور اپنے ادب سے لوگوں کے اذہان کو غیر محسوس طریقے پر متاثر کرتا ہے اور آخر کار انھیں ایک خاص نہج پر سوچنے کے لیے مجبور کر دیتا ہے۔ ادیبوں کے اس اہم کردار کو پیش نظر رکھا جائے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ نظریاتی استحکام میں ادیبوں کے تعمیری کردار کے ذریعے سے بہت مدد مل سکتی ہے۔

سنہ ۱۸۵۷ء کی وقتی طور پر ناکام جدوجہد کے بعد برصغیر کے مسلمانوں پر ایسی افسردگی اور مایوسی چھا گئی تھی کہ بہ ظاہر کوئی امید نظر نہیں آتی تھی کہ یہ قوم پھر زندہ ہو سکے گی اور کاروان حیات اجتماعی پھر جادہ پیا ہو سکے گا۔ اللہ بھلا کرے سرسید احمد خاں مرحوم اور ان کے رفقائے کار کا کہ انھوں نے ادبی محاذ کی اہمیت و افادیت کا اندازہ کیا اور ایسا شان دار اردو لٹریچر مہیا کر دیا کہ قوم از سر نو انگڑائی لینے لگی۔ کوئی قوم ایسی نہیں کہ جب اس کا شاعر آواز دے کہ :

کسی نے یہ بقراط سے جا کے پوچھا
مرض تیرے نزدیک مہلک ہیں کیا کیا؟
کہا دکھ جہاں میں نہیں کوئی ایسا
دوا جس کی خالق نے کی ہو نہ پیدا

تو وہ ایک بار آنکھ کھول کر نہ دیکھے اور اپنی بیماری کا علاج تلاش نہ کرے۔

سرسید، شبلی، حالی اور ان کے تمام دوسرے معاصرین نے مسلمانوں میں از سر نو جان پیدا کر دی۔ برصغیر کا مسلمان ان ادیبوں کے احسانات سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ انھوں نے اسے اسلام کی عظمت یاد دلائی اور یہ بتایا کہ اسلامی نظریہ ہی اس کی دنیاوی سربلندی اور اخروی نجات کا وسیلہ ہے۔ دیکھیے کہ ادیب کس کس طرح قوم کے دل میں اپنی بات اتارتا ہے۔ ایک جگہ حالی نے یہ ذکر کیا کہ کسی نے ایک دانا سے پوچھا کہ سب سے بڑی نعمت کیا ہے؟ دانا نے جواب دیا "عقل! یہ نہ ہو تو علم و فن اور یہ بھی نہ ہو تو دولت۔" سائل نے کہا کہ اگر ان میں سے کچھ نہ ہو تو؟ اس کے جواب میں دانا کی زبان سے حالی کہتے ہیں :

کہا اس پہ بجلی کا گرنا ہے بہتر

اور

وہ ننگ بشر تاکہ ذلت سے چھوٹے
خلائق سب اس کی نحوست سے چھوٹے

سرسید احمد اور ان کے ہم عصر ادیبوں نے مسلم معاشرے میں از سر نو جان پیدا کر دی۔ انھی دنوں اردو کی ابتدائی تعلیم کے لیے انجمن حمایت اسلام لاہور نے اردو کی

پہلی، دوسری، تیسری اور چوتھی کتابیں شائع کیں۔ یہی کتابیں پورے برصغیر کے مسلمان بچے پڑھتے تھے۔ اس کا پہلا سبق غالباً اس طرح شروع ہوتا تھا کہ اللہ ایک ہے۔ وہ پاک اور بے عیب ہے۔ اس جیسا کوئی اور نہیں۔ وہ سب سے بڑا بادشاہ ہے وغیرہ وغیرہ۔ ان کتابوں کے مضامین اس طرح مرتب کیے گئے تھے کہ بچوں کو اردو زبان کے علاوہ اسلام کی بنیادی باتیں بھی معلوم ہوجاتی تھیں اور اسلاف کے قابل تقلید کارناموں کی ایک جھلک بھی نظر آجاتی تھی۔ میرا خیال ہے کہ اس سے بہتر ابتدائی کتابیں آج تک نہ لکھی جاسکیں۔ اس دور میں ہمارے ادیبوں نے جو لٹریچر مہیا کیا اس کا محور اسلام تھا اور مسلمان بچے بچیوں میں اسلاف کی محبت، ان کے شان دار کارناموں سے واقفیت اور غیر محسوس طریقے سے دلوں میں عظمت رفتہ کی بحالی کی تمنا پیدا ہو جاتی تھی۔ بچوں کی زبانوں پر جو اشعار ہوتے تھے ان کی ابتدا کچھ اس طرح ہوتی تھی:

الف سے اللہ کو جانو، ب سے بسم اللہ کو
ت سے ہے تیرا اشارہ بس رسول اللہؐ کو

مسدس حالی کے اکثر اشعار ورد زبان ہوتے تھے اور بیت بازی کے رواج کی وجہ سے اکثر بچوں کو سیکڑوں اشعار اس طرح یاد ہوتے تھے کہ جب چاہا سنا دیا۔ ان تمام ادبی کاوشوں کا نتیجہ یہ تھا کہ بچے عموماً اسلام کی محبت سے سرشار ہوتے تھے اور وہ بھی جو اتفاقاً جوانی کی دیوانگی کی وجہ سے بہک جاتے تھے آخر کار اپنے محور پر واپس آجاتے تھے۔

اردو ادب کا دوسرا شان دار دور تحریک خلافت کا ہم عصر سمجھنا چاہیے۔ اس دور میں ایسا انقلابی لٹریچر پیدا ہوا جس نے مسلمانوں میں نہ صرف احیائے دین کی تڑپ پیدا کردی بلکہ انھیں از سر نو انگریزوں کے استبداد کے خلاف محاذ آرا ہونے پر تیار کردیا۔ مولانا محمد علی جوہر، مولانا ابوالکلام آزاد، علامہ اقبال، مولانا ظفر علی خاں، مولانا اکرم خاں اور دوسرے بے شمار ادیبوں نے وہ کارہائے نمایاں انجام دیے جن کا احاطہ کرنا اس مختصر سے مضمون میں مشکل ہے۔

جب خلافت تحریک شروع ہوئی تو اس وقت مسلمان دو طبقوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ایک دین داروں کا طبقہ تھا جو الحاد کے سیلاب سے قوم کو بچانا مشکل سمجھتے ہوئے

مدرسوں اور خانقاہوں میں سمٹ گیا تھا۔ دوسرا نئی روشنی والا انگریزی داں یا مغرب زدہ طبقہ تھا۔ دونوں میں بعد المشرقین تھا۔ مولانا محمد علی نے لکھا ہے کہ آخر کار صورت یہ پیدا ہوگئی کہ دونوں طبقے ایک دوسرے سے قریب ہوگئے اور محسوس کرنے لگے کہ ان میں سوائے غلط فہمی کے اختلاف کی کوئی بنیادی وجہ نہیں۔ یہ اتنا شان دار کارنامہ تھا کہ اس کا جواب نہیں۔ یہ کارنامہ کن لوگوں نے انجام دیا؟ یہ اردو ادب ہی کا بے مثال کارنامہ تھا جس نے مسلمانوں میں وحدت فکر پیدا کی اور حریت کا جذبہ بیدار کیا۔ یہاں تک کہ جب سیاسی قائدین نے منزل کا تعین کیا تو پوری قوم ایک منظم اور متحدہ قوت کے ساتھ ہر قسم کی جاں فشانیوں اور قربانیوں کے ساتھ منزل کی جانب رواں دواں ہوگئی۔ مولانا محمد علی جوہر، علامہ اقبال، مولانا ظفر علی خاں اور دوسرے ان کے ہم خیال رفقائے کار کی صداقت، بے لوثی اور قلم کی طاقت نے تمام غبار راہ صاف کر دیے۔ پہاڑوں کی بلندی، صحراؤں کی وسعت اور سمندروں کی موجیں، کوئی چیز بھی ان کے عزائم میں تزلزل پیدا نہ کرسکی اور وہ یہ کہتے ہوئے آگے بڑھتے رہے کہ :

دشت تو دشت ہیں دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے
بحر ظلمات میں دوڑا دیے گھوڑے ہم نے

خاص طور پر علامہ اقبال کی شاعری نے ذہنوں کو جھنجھوڑا اور اسلامی عقائد و افکار کی اہمیت کو اجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ عظمت اسلاف سے آشنا کیا۔ برصغیر کے مسلمانوں کو بیدار اور ان میں اسلام کی محبت پیدا کرنے میں اقبال کے ادب نے زبردست کردار ادا کیا ہے۔ ان کے افکار اور ان کا کلام آج بھی پاکستان کے ادیبوں کے لیے مشعل راہ ہے اور فکری اور فنی دونوں اعتبار سے ہمارے ادیبوں کی رہنمائی کرتا ہے۔

اردو ادب کی بے پناہ طاقت کااندازہ کرنے کے لیے انھی دنوں ہونے والا ایک واقعہ سن لیجیے۔اس کے راوی ڈاکٹر عندلیب شادانی مرحوم ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ایک مرتبہ جب کان پور کی مسجد میں مسلمان جمع ہوئے تو باہر انگریزوں نے فوج متعین کر دی۔ ایک جانب نہتے مسلمان تھے اور دوسری جانب انگریز حکمراں کی جابرانہ طاقت تھی۔ مسلمان جوش سے پُر تھے۔ جان دینے پر آمادہ تھے۔ مسلمان حق پر قربان ہو جانے

کے لیے بے چین تھے۔ بار بار جوش و غضب سے پُروہ مسجد سے باہر آکر اپنی جان، جان آفریں کے سپرد کرنا چاہتے تھے۔ بڑھتے تھے، لیکن پیچھے آجاتے تھے۔ ایسے میں ایک پُرجوش آواز نے للکارتے ہوئے غالب کا شعر پڑھ دیا کہ :

رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جو آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو وہ لہو کیا ہے

بس تذبذب کا بند ٹوٹ گیا اور مسلمان جوش ایمانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے آگے بڑھتے رہے اور جام شہادت پیتے رہے۔

پاکستان ایک نظریاتی مملکت ہے۔ اس نظریاتی قلعے کو مستحکم کرنے کے لیے اردو ادب کو اپنا کردار ادا کرنا چاہیے۔ ادیبوں کا اشتراک عمل اس نظریاتی مملکت کے لیے ضروری ہے۔ ادیبوں میں اخبار نویس، شاعر، ناول نگار، افسانہ نگار، ڈرامہ نگار اور تمام دوسری اصناف ادب سے دل چسپی رکھنے والے ارباب فکر و قلم شامل ہیں۔

اسی کے ساتھ ہمیں چاہیے کہ ہر بڑے شہر میں چند ادارے ایسے قائم کریں کہ جو نوجوان اور نو آموز لکھنے والوں کی سرپرستی کریں اور انھیں مضامین، افسانے، ناول، ڈرامے اور شاعری وغیرہ کی راہ پر لگانے کی کوشش کریں اور نظریاتی طور پر بھی مستحکم کریں۔ اس طرح ہر صنف ادب میں ایسے لکھنے والے پیدا ہو جائیں گے جو پاکستانی نظریے کی حمایت میں لکھیں گے۔ ہر نظریۂ حیات کے استحکام کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ ادیبوں کی ایک بڑی جماعت ایسی ہو جو خود اس نظریے پر یقین رکھتی ہو اور جو کچھ لکھتی ہو اپنے نظریۂ حیات سے پوری وابستگی کے ساتھ لکھتی ہو۔

پاکستانی اردو

اردو ایک زندہ زبان ہے جس میں ارتقا کا عمل زندگی کے بدلتے ہوئے تقاضوں کی مطابقت میں مسلسل جاری ہے۔ تقسیم ملک اور قیام پاکستان کے بعد لسانی تشکیل نو کی رفتار میں نمایاں طور پر تیزی آئی ہے جس کی وجہ پاکستان کی علاقائی زبانوں اور یہاں کی علاقائی ذیلی ثقافتوں سے اردو زبان کی ہم آہنگی پیدا کرنے کی ضرورت رہی ہے۔ زبان ہر ثقافت کا اہم ترین عنصر ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی نوعیت میں اپنے ثقافتی مزاج کی آئینہ دار بھی ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ یہاں کے تہذیبی اور ثقافتی مزاج کو نظر انداز کر کے اپنی نحوی ساخت اور تراکیب و استعارات کے استعمال میں اجتہاد سے کام نہ لے۔ پاکستان میں اردو زبان میں تشکیل نو کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم پاکستان کی ثقافت کے بارے میں اپنا ذہن صاف کر لیں۔

ہمارے ہاں سرسید احمد خاں پہلے دانشور ہیں جنھوں نے تہذیب کے موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے اس کی اہمیت کو واضح کیا ہے اور بتایا ہے کہ جب کسی علاقے میں انسانوں کا کوئی گروہ ایک ساتھ رہتا ہے تو اس کا رہن سہن' اس کے اکل و شرب' اس کی پوشاک اور نیکی و بدی سے متعلق اس کے تصورات اور معیارات یکساں ہوتے ہیں۔ یکسانیت کی اس صورت کو ہم اس کی تہذیب کہتے ہیں۔ اس تہذیب کی تشکیل و تعمیر میں اس علاقے کے جغرافیے اور تاریخ کا کردار بہت اہم ہوتا ہے۔ تہذیب کی اہمیت کو محسوس کرنے اور اس کی وضاحت کرنے میں سرسید کو بلاشبہ اولیت کی فضیلت حاصل ہے' لیکن انھوں نے تہذیب اور ثقافت کے فرق کو واضح نہیں کیا اور شاید ان کے عہد میں اس فرق کو واضح کرنا ممکن بھی نہ تھا۔ اس فرق کا احساس زمانۂ حال کی دریافت ہے جس میں مختلف اقوام کے درمیان بڑھتے ہوئے میل جول اور

تہذیبی اقدار کے لین دین نے ایک نئی صورت پیدا کر دی ہے۔ اب تہذیب سے مراد شائستگی اطوار اور اخلاقی اقدار ہیں جب کہ ثقافت کسی گروہ کے علوم و فنون اور تکنیکی پیش رفت کو قرار دیا جاتا ہے اور ان دونوں جہتوں کے امتزاج کو کلچر سے تعبیر کرتے ہیں۔

پاکستان میں تہذیب و ثقافت اور اس کے کلچر کا ایک بڑا دائرہ ہے جسے پاکستان کا قومی کلچر کہنا چاہیے، لیکن اس دائرے کے اندر کئی چھوٹے چھوٹے دائرے ہیں جنھیں پاکستان کے ذیلی یا علاقائی کلچر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ چھوٹے چھوٹے دائرے اپنی انفرادیت برقرار رکھنے کے باوجود اپنے جوہر میں پاکستان کے قومی کلچر کے بڑے دائرے سے باہر اپنا وجود نہیں رکھتے۔ مثلاً پنجاب اور سندھ میں پوشاکوں کی تراش مختلف ہو سکتی ہے، لیکن ستر پوشی کا اصول سب جگہ یکساں ہے۔ اسی طرح یہاں کے مختلف کھانے پکانے کے انداز الگ الگ ہو سکتے ہیں، لیکن غذاؤں کے حرام و حلال ہونے کا تصور سب جگہ یکساں ہے۔ اس طرح فروعی اختلافات کے باوجود یہاں کی تہذیب و ثقافت کے عناصر میں کوئی فرق نہیں ہے اور بنیادی عناصر کی یہ یکسانیت ہمارے مذہبی عقائد کی یکسانیت کا نتیجہ ہے۔ اردو زبان میں بہت سی تلمیحات ہماری مذہبی روایات سے ماخوذ ہیں۔ مثلاً آتش نمرود، ضرب کلیم، عیسیٰ نفس، ابن مریم، ذبح عظیم، آداب فرزندی، شق القمر وغیرہ وغیرہ۔ ہم ان تلمیحات کو اپنے قومی کلچر کا حصہ کہیں گے جب کہ ہیر رانجھا، کچا گھڑا، سسی پنوں اور سوہنی مہیوال ایسی تلمیحات ہیں جن کا تعلق ہماری علاقائی ثقافتوں سے ہے۔ جدید اردو شاعری میں ان علاقائی تلمیحات کا استعمال پاکستان کی اردو کی شناخت ہے۔ تقسیم ملک اور قیام پاکستان سے پہلے اردو شاعری میں ان تلمیحات کا استعمال نہ ہونے کے برابر تھا، لیکن اب ان تلمیحات نے خاصے بڑے پیمانے پر مقبولیت حاصل کر لی ہے۔

تلمیحات سے قطع نظر نحوی ساخت میں کچھ تبدیلیاں اور علاقائی زبانوں کے کچھ الفاظ کا اردو زبان میں استعمال پاکستان میں اردو زبان میں ارتقا و توسیع کے عمل کو اجاگر کرتا ہے۔ مثال کے طور پر "مجھے جانا ہے" کی جگہ "میں نے جانا ہے" کا استعمال اب روز مرہ ہی میں نہیں بلکہ بہت سی علمی و ادبی تحریروں میں خاصا عام ہوتا جارہا ہے جو ہماری زبان کی نحوی ساخت میں تبدیلی کی ایک مثال ہے۔ اسی طرح سندھی لفظ "پگار"

یعنی تنخواہ نے اردو روزمرہ کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ سندھی اور سرائیکی زبان کا ایک لفظ "سائیں" ہے جو جناب یا محترم کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ تقسیم ملک سے پہلے اردو زبان میں یہ لفظ گداگر یا فقیر اور بھکاری کے معنی میں استعمال ہوتا تھا، لیکن اب یہ لفظ اردو میں بھی معزز یا محترم کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے جس کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ بہت سے نئے شاعر اس لفظ کو اپنی نظموں اور غزلوں میں برابر استعمال کر رہے ہیں۔ مثال کے طور پر رسا چغتائی کا یہ مطلع دیکھیے:

پاس اپنے اک جان ہے سائیں
باقی یہ دیوان ہے سائیں

اس غزل میں "سائیں" بطور ردیف استعمال ہوا ہے جو اس غزل کے ہر شعر میں موجود ہے۔ اسی طرح اور کئی شاعر ہیں جن کے ہاں سائیں کا لفظ نہایت خوبی کے ساتھ معزز اور محترم کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

علاقائی اثرات سے قطع نظر ہمارے قومی کلچر کی مطابقت میں عربی و فارسی الفاظ سے تشکیل دی ہوئی بہت سی تراکیب ہماری شاعری میں نظر آتی ہیں۔ ان تراکیب کا استعمال تقسیم ملک سے پہلے اس افراط سے کبھی نہیں ہوا، بلکہ ادبی حلقوں میں ٹھیٹھ اردو کے نام سے ایسی زبان نظر آتی تھی جس میں عربی و فارسی کے الفاظ کم سے کم ہوتے تھے۔ البتہ علامہ اقبال کی شاعری اس سلسلے میں استثنا کی مثال ہے۔ اب ہم روز مرہ میں بھی عربی و فارسی کے الفاظ کثرت سے استعمال کرتے ہیں جس کا اندازہ ریڈیو اور ٹی وی سے نشر ہونے والی خبروں سے بھی بہ آسانی کیا جا سکتا ہے۔

ریڈیو، ٹی وی اور اخبارات کے علاوہ حکومت نے "مقتدرہ" جیسے ادارے کے قیام کا ایک مقصد اردو میں سرکاری خط کتابت کے لیے انگریزی اصطلاحات کو اردو میں ڈھالنے کا کام بھی قرار دیا ہے اور اس سلسلے میں خاصا کام ہو رہا ہے۔

پاکستان میں اردو زبان کی تشکیل نو کے سبب یہاں کی زبان ہندستان کی اردو زبان سے خاصی مختلف ہوتی جا رہی ہے۔ ہندستان میں ہندی کے کچھ الفاظ اردو میں رفتہ رفتہ شامل ہو رہے ہیں جس کی وجہ سے وہاں کی زبان پاکستان کی اردو زبان سے مختلف ہوتی جا رہی ہے جس کا سبب وہاں کا کلچر اور اس کے تقاضے ہیں جو پاکستان کے کلچر سے مختلف

بنائے بغیر ہم قوم کے ساتھ خود کو بھی فریب ہی دیتے رہیں گے۔

زبان سے کہنا کہ اردو ہماری قومی زبان ہے، مگر تعلیم غیر زبان میں دینا اور دفتری کاربار بھی غیر زبان میں کر کے رہی سہی صلاحیت کار اور کارکردگی کا بھی نقصان کرنا، ایسے تضادات ہیں جن کی سزا معمولی نہیں ہے اور یہ سزا مل رہی ہے کہ معاشرے کا ہر فرد غیر مطمئن ہے اور انتشار و افتراق کی صورت میں اس سے بڑی سزا بھی مل سکتی ہے۔ زندہ قوموں کو اور آزاد معاشروں کو یہ دو رنگی زیب نہیں دیتی۔ اردو کو اگر قومی زبان واقعی بنانا ہے تو پھر قوم کو زبان دے دیجیے اور قوم کی زبان آپ بھی سیکھ لیجیے تاکہ وہ کہہ سکے اور آپ سن سکیں۔

میں جناب محترم جسٹس انوار الحق صاحب کو خراج تحسین پیش کرتا ہوں کہ ان کی شرکت و موجودگی ہماری ہمت افزائی کا باعث ہے اور ہم زیادہ اعتماد کے ساتھ اردو کے معاملے میں انصاف طلب کر سکتے ہیں۔ ان کی اردو دوستی اور اردو نوازی تاریخ پاکستان کا ایک سنگ میل ثابت ہوگی۔ ان شاء اللہ۔

جناب جسٹس ذکی الدین پال صاحب کی تشریف آوری کے لیے ہم بہ صمیم قلب شکر گزار ہیں اور جناب ڈاکٹر وزیر آغا صاحب، جناب ڈاکٹر سید مرتضیٰ اختر جعفری صاحب، محترم محمد رمضان خاں بلوچ صاحب کی شرکت اور تعاون بھی باعث تشکر ہے کہ ان حضرات کے افکار عالیہ کی روشنی میں منزل اردو کو شاید نشان راہ مل سکے۔

جناب ڈاکٹر سید عبد اللہ صاحب کا شکریہ کس طرح ادا کیا جائے کہ وہ تو اردو پر فدا ہیں اور ان کی پیری اردو جوانی پر صدقے ہونے کو ہمیشہ تیار رہتی ہے۔ میں تمام دانش وروں کی موجودگی میں ڈاکٹر سید عبد اللہ صاحب کی خدمت میں قوم کی جانب سے "دانائے اردو" کا خطاب پیش کرتا ہوں۔

آخر میں صرف یہ عرض کروں گا کہ اردو کو مٹانے والے مٹ جائیں گے اور اردو انشاء اللہ پاکستان کو بام عروج پر پہنچانے میں اپنا کردار ادا کر کے رہے گی۔

(شام ہمدرد، لاہور، ۷ دسمبر ۱۹۷۸ء)

اردو اور سائنس

سائنسی ترقی کی جس منزل پر آج ہم کھڑے ہیں وہاں دنیا کی ساری قومیں اس کے تسلسل میں اپنے اپنے کردار کی جستجو کر رہی ہیں۔ اقوام عالم تاریخی' ثقافتی اور لسانی حوالوں سے اس امر کا جائزہ لینا چاہتی ہیں کہ سائنس کی ترویج و اشاعت میں ان کا کیا حصہ ہے؟ اس نقطۂ نظر کی کیا اہمیت ہے' فی الحال اس سے بحث نہیں ہے' لیکن یہ حقیقت بہرحال مسلم ہے کہ یہ مسئلہ نہ تو صرف سائنس سے متعلق ہے اور نہ صرف زبان سے' بلکہ یہ تہذیب و تمدن کا مسئلہ ہے۔ انسانی تہذیب کے ہر دور کی روایات میں سائنس کی کچھ نہ کچھ جھلکیاں ضرور ملتی ہیں' اس لیے سائنس کو انسانی علوم کے ایک شعبے کے بجائے انسانی تہذیبی تسلسل و ارتقا کا ایک حصہ سمجھنا زیادہ صحیح ہوگا۔

زبان چونکہ تہذیبی اقدار کی عکاس اور معاشرتی ارتقا کے ذریعۂ اظہار کی حیثیت رکھتی ہے' اس لیے اس کے سرمائے میں سائنسی شعور کی جھلکیوں کی جستجو غیر منطقی نہیں ہے۔ سائنس تاریخ کے ہر دور میں تمدن کی روایت بن کر زبان کو متاثر کرتی رہی ہے اور زبان اس کی عطا کردہ دولت کو اپنے دامن میں سمیٹ کر الفاظ و اصطلاحات اور مفاہیم و معانی کے نئے پیکر تراشتی اور اس کے حقائق کا شعور عام کرتی رہی ہے۔

اس مقدمے کو ذہن میں رکھتے ہوئے اردو اور سائنس کے عنوان سے کوئی جائزہ لیا جائے تو جو حقیقت بہت نمایاں ہو کر سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ اردو اپنے دامن میں ابتدا ہی سے سائنس کا سرمایہ رکھتی ہے اور برصغیر میں ان دونوں کا ارتقا ایک دوسرے کے دوش بہ دوش ہوا ہے۔

بظاہر یہ بات کچھ عجیب سی ہوگی کہ اردو جو اپنے ابتدائی دور میں محض ایک بولی تھی' اس کا رشتہ سائنس سے جوڑ دیا جائے اور یہ کہا جائے کہ اس دور میں' جب کہ

خود سائنس بھی آج کی طرح متعارف نہیں ہوئی تھی، سائنس کی اصطلاحوں سے اردو کا دامن معمور ہو رہا تھا۔ اس حقیقت کے ادراک کے لیے ماضی کی طرف پلٹ کر دیکھنا ہو گا۔

برصغیر میں مسلمانوں کی آمد کے بعد جو نیا تہذیبی دور شروع ہوا اس کے زیر اثر روایات کے باہمی تبادل کے فطری عمل کی ایک نئے طرز سے ابتدا ہوئی۔ ہر چند کہ تہذیبی اختلاط سے بول چال کی ایک نئی زبان کی تشکیل کے آثار نظر آنے لگے تھے، مگر عرصے تک مسلمانوں ہی کی نہیں، بلکہ پڑھے لکھے غیر مسلموں کی بھی علمی، تعلیمی اور دفتری زبان فارسی ہی رہی۔ نظام تعلیم کے دو اہم حصے تھے، منقولات اور معقولات۔ اول الذکر فیکلٹی میں سارے مذہبی علوم آجاتے ہیں اور آخر الذکر میں سائنسی مضامین یعنی طب، ریاضی، ہیئت، نجوم، صنعت اور زراعت وغیرہ آتے ہیں۔

منقولات کی فیکلٹی سے فارغ ہونے والے حضرات عوام کے بجائے خواص سے رشتہ زیادہ رکھتے تھے۔ ان کی علمی موشگافیوں سے صرف وہی لوگ مستفید ہو سکتے تھے جو طبقۂ علما میں شمار ہوتے تھے۔ اس طبقے کی علمی زبان یا تو عربی اور فارسی تھی یا سنسکرت۔ اس لیے وہ ٹوٹ پھوٹ کے عمل سے گزر کر ابھرتی ہوئی نئی زبان کی طرف بہت بعد میں ملتفت ہوئے۔ جبکہ سائنسی سے متعلق شعبہ ہائے علوم سے فارغ ہونے والے حضرات میں ایک طبقہ ایسا تھا جس کا رشتہ عوام و خواص دونوں سے یکساں تھا اور وہ تھا اطبا کا طبقہ۔ ان کا دائرۂ خدمت خلق بلا امتیاز مذہب و ملت بہت وسیع تھا۔ فطری، سائنسی اور سستے علاج کی وجہ سے عوام کا مرجوعہ ان کی جانب بہت زیادہ تھا۔ عوام کے ساتھ اس اختلاط کے نتیجے میں اس نئی زبان نے اپنے ابتدائی مرحلے پر ہی ان کے اثرات قبول کیے۔ طب کی بے شمار اصطلاحیں بول چال کی زبان میں داخل ہوگئیں، حتّیٰ کہ یہ اصطلاحیں شعری اظہار کا ذریعہ بھی بن گئیں۔ طبی الفاظ کے ذخیرے سے اس بولی میں وسعت پیدا ہوتی رہی، یہاں تک کہ تحریر کے مرحلے میں پہنچ گئی۔

اردو نثر کی تاریخ کا ابتدائی سرمایہ اپنے دامن میں مذہبی مسائل کے ساتھ ساتھ سب سے زیادہ اطبا کی بیاضوں میں لکھے ہوئے نسخے اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔

طب چونکہ سائنس کا اہم شعبہ ہے، اس لیے یہ دعوا کرنا غلط نہ ہوگا کہ میڈیکل

سائنس کی اصطلاحیں اور طبی موضوعات کے بیشتر مضامین برصغیر کی نئی زبان میں داخل ہوگئے۔ حکما اور اطبا نے صرف اصطلاحیں اور الفاظ ہی نہیں دیے' بلکہ محاورات اور ضرب الامثال کے ذخیرے بھی دیے اور شعر و ادب پر بھی اطبا اور طبی سائنس کے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ اس طرح یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ سائنسی شعور ابتدا ہی سے اردو کے مزاج کا حصہ بنتا جارہا تھا اور یہ زبان اپنی جذب و قبول کی اہلیت کی بدولت جدید سائنس کی ترویج و ارتقا کے بعد بھی اس کی خدمت میں پیش پیش رہی۔ اردو کو آگے بڑھانے والوں نے اسے سائنس کے ترقی یافتہ عہد کی ممتاز زبان بنانے میں اس کی ان صلاحیتوں سے فائدہ اٹھایا جن کی آبیاری ابتدا میں اطبا نے کی تھی۔

۱۸۶۳ء میں سرسید کی قائم کردہ سائنٹفک سوسائٹی دراصل اردو سے ان کی وسیع توقعات کی مظہر تھی' حالانکہ ابھی اردو نثر پختگی کی راہ سے گزر رہی تھی۔ صنعتی اور مشینی اصطلاحوں کا ترجمہ اسی سوسائٹی کی کوششوں سے ہوا۔ رڑکی انجینئرنگ کالج میں بعض کتابیں داخل نصاب بھی ہوئیں۔

بیسویں صدی کے آغاز میں ایک خاص سیاسی مقصد کے تحت انگریزی مسلط کر دی گئی اور اردو کے سائنسی مزاج کے ارتقا کی راہ میں ایک دیوار کھڑی کر دی گئی' مگر بہت جلد برصغیر کی مشترک عوامی زبان کے بہی خواہوں نے جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن کے قیام کے ساتھ ۱۹۱۷ء میں ایک دارالترجمہ بھی قائم کر دیا جس کے اہتمام سے سائنس' ریاضی' طب جدید و قدیم' فلسفہ' نفسیات' عمرانیات' سیاسیات' انجینئرنگ اور متعدد سائنسی مضامین کی اہم کتابوں کے اردو مترجمہ کتب پیش کر کے اردو کی سائنسی روح کو دوبارہ زندہ کر دیا۔ جدید سائنس کا شاید ہی کوئی موضوع ایسا ہو جس پر دارالترجمہ عثمانیہ یونی ورسٹی نے کوئی اردو ترجمہ نہ پیش کیا ہو۔ بہ شمول طب ان مترجمہ کتب کی کل تعداد چھے سو سے زیادہ ہے۔ اس طرح اردو سائنسی ترقی کے عہد میں سائنس کی ترجمانی اور سائنسی مسائل کی قابل اعتماد تشریح و تفہیم کے مقام و منصب پر دوبارہ فائز ہوگئی اور اس کے بعد سے آج تک سائنس اور اردو دونوں ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہیں۔

انگریز جب ہندستان میں آئے تو اردو میں طبی سائنس کی کتابوں کی تالیف و ترجے کی سرگرمیوں میں اور بھی اضافہ ہوا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اردو کو سائنسی زبان بنانے

میں انھوں نے بھی تاریخی کردار ادا کیا ہے۔ انھی کی کوششوں سے انیسویں صدی میں اردو میں میڈیکل سائنس کا ایک اچھا خاصا لٹریچر مہیا ہوگیا۔ نمونے کے طور پر بہ اعتبار سنین چند کتابوں کا ذکر کرنا مناسب ہوگا:

نام مترجم	نام کتاب	نام طابع	سنہ اشاعت
۱۔ ہوپر رابرٹ مترجمہ ٹیٹلر جان	انیس المشرحین	سوسائٹی ایشیاٹک کلکتہ	۱۸۳۶ء
۲۔ جی جی اسپلر بری	لندن فارما کوپیا	بشپ کالج پریس، کلکتہ	۱۸۴۵ء
۳۔ رحیم خاں	علم و عمل قابلہ	مطبع سلطانی، لاہور	۱۸۷۹ء
۴۔ بیلی رام	آئینہ امراض غشش و قلب	مطبع قادری، انجمن مفید عام لاہور	۱۸۸۲ء
۵۔ رحیم خاں	رسالہ امراض الصبیان	مطبع گلزار محمدی، لاہور	۱۸۹۰ء
۶۔ ڈاکٹر میر فضل علی دہلوی	رسالہ تشریح الاجسام	مطبع شوکت اسلام، لکھنؤ	۱۸۹۰
۷۔ رحیم خاں	طب رحیمی	مطبع گلزار محمدی، لاہور	۱۸۹۲ء
۸۔ رائے مہندر ناتھ	مدوائنفری	مطبع نظائر قانون، الہ آباد	۱۸۹۲ء
۹۔ ڈاکٹر سیمول آسبرن : ترجمہ سید زوار حسین	علاج بر محل یعنی اول امداد	نول کشور، لکھنؤ	۱۸۹۶ء

ان تفصیلات کی روشنی میں یہ بات وثوق و اعتماد کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ اول اول اردو کو سائنس کی ترجمانی کی اہلیت اطبا ہی نے بخشی۔ اسی کے ساتھ ہمیں فراخ دلی

سے اس امر کا بھی اعتراف کرنا چاہیے کہ اطبا اور عوام کے قریبی تعلقات ہی نے اس زبان کو نہ صرف مقبول عام بنایا، بلکہ عوامی بنایا اور عوام و خواص کے درمیان رابطے کی زبان بنا کر مختلف تہذیبوں اور تمدنوں کی علمی اور فکری روایات کا حسین ترین نمونہ بنا دیا۔ اس طرح اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ شروع ہی سے اردو زبان اپنے سائنسی اور علمی مزاج کے لیے اطبا کی ممنون ہے۔

(۲۷ جنوری ۱۹۸۸ء)

سائنس کی تعلیم مادری زبان میں

نوع انسانی آج جس دور اضطراب سے گزر رہی ہے اور ترقی کی تڑپ کا جو عالم سارے جہان پر طاری ہے' اس میں ایک طرف انسان کا آگے بڑھنے اور قدرت کی طاقتوں کو مسخر کر کے اپنے لیے آسائش فراہم کرنے کا جذبہ کارفرما ہے اور دوسری طرف اس جذبے کے بے راہ رو ہو جانے کے مظاہر نمایاں ہیں۔ ترقی کرنے کا جذبہ فطری ہے۔ تمدن و سائنس کے جو کارنامے اور کرشمے آپ کو نظر آتے ہیں' یہ سب اسی جذبے کے مظاہر ہیں' لیکن اس ترقی میں جنگ و فساد کا عنصر بھی شامل ہو گیا ہے اور آج کی دنیا اپنی تمام تر ترقیوں کے باوجود امن و سکون کو ترس رہی ہے۔ ہمارے بعض بزرگ اس صورت حال کا ذمے دار سائنس کو قرار دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں فساد کی جڑ اور خرمن امن کے لیے چنگاری کی حیثیت سائنس کو حاصل ہے۔

مجھے اس نقطۂ نظر سے اختلاف ہے۔ سائنس کی حیثیت ایک ذریعے کی ہے۔ مذہب ہو یا سائنس' ادب ہو یا آرٹ' ان سب کا منتہائے نظر انسان کی بقا و فلاح اور بدی کے چنگل سے آزادی ہے۔ سائنس کا مقصد قوانین قدرت کی دریافت اور اس کے نتیجے میں انسانی خوش حالی ہے۔ اگرچہ سائنس کو اقوام و افراد کے مقصد حیات کی حیثیت حاصل نہیں ہے' لیکن سائنس انسانی فلاح اور کاروان حیات کی امداد و اعانت کا فریضہ ادا کرتی ہے۔ ایسی صورت میں سائنس کو تخریب و تلاطم کا ذمے دار قرار دینا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ ہاں سائنس کے صحیح یا غلط استعمال پر تعمیر و تخریب کا بہت کچھ انحصار ہے۔ یہ ایک ایسا ہتھیار ہے جسے آپ اچھے اور برے' دونوں مقاصد کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔

اب بات اس کے استعمال کرنے والوں پر آکر ٹھیرتی ہے۔ آپ اسے اچھائی اور خیر

و فلاح کے لیے استعمال کریں تو یہ آپ کی بہترین خادم ہے۔ شر و فساد کے لیے استعمال کریں تو یہ آپ کی دشمن ہے۔

قرآن مجید بھی ہمیں تسخیر کائنات اور انفس و آفاق کی آیات پر غور و فکر کی بار بار دعوت دیتا ہے۔ اسلام دین فطرت ہے۔ وہ فطرت کے تقاضوں کی نفی نہیں کرتا، حد بندی ضرور کرتا ہے۔ یہ حدود ہی ہیں جو انسان کو تخریب و تباہی کے غار میں گرنے سے بچاتی ہیں اور تعمیر و تنظیم کی راہ بتاتی ہیں۔ انسان اپنے مشاہدے، تجربے اور تعقل کے ذریعے سے جو معلومات اور حقائق دریافت کرتا ہے، ان کے انضباط کا نام سائنس ہے۔ جستجو اور تجسّس انسانی جبلت میں شامل ہے اور ہر جبلت اپنی نمود و تکمیل کے لیے کوئی راہ ڈھونڈتی ہے۔ اسلام اس انسانی جبلت کو تعمیری راہ پر لگاتا ہے اور اس کے اظہار کے وسائل فراہم کرتا ہے۔ یہی جبلت اگر غلط رخ اختیار کر لے تو تخریب و تباہی کی راہ پر چل پڑتی ہے۔ اس کو صحیح رخ مل جائے تو کاروان تمنا تعمیر و ترقی کی منزل کی جانب رواں دواں ہو جاتا ہے۔

سائنٹفک سوسائٹی پاکستان نے بجا طور پر قومی زبان اردو کو سائنسی علوم کی اشاعت کا ذریعہ بنایا ہے۔ مجھے اردو اس لیے آتی ہے کہ یہ میری مادری زبان ہے۔ جہاں تک اردو میں اظہار و بیان کی قدرت کا سوال ہے، مجھے اپنی کوتاہی کا احساس ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ مجھے اردو کی صلاحیت و اہمیت کا احساس نہیں ہے یا میں اردو کو سائنسی مضامین کی ترجمانی کا اہل نہیں سمجھتا۔ میرے خیال میں اردو کی اہلیت کی بات بالکل الگ ہے اور اردو کی ضرورت کی بات بالکل جدا ہے۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ اردو سائنس کے مطالب کے اظہار میں کامل نہیں ہے، تب بھی اس سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ اردو میں سائنس کی منتقلی اور تعلیم کی ضرورت نہیں ہے۔

پہلے یہ بات مان لینی چاہیے کہ علوم کو اپنی قومی زبان میں پڑھانا ضروری ہے۔ پھر اس ضرورت کی تکمیل کے لیے اس کے وسائل و ذرائع پر نظر ڈالیے۔ اگر اردو میں کچھ کمی ہے تو اس کمی کو دور کیا جائے۔ کمی کیوں نہ ہوگی، ہر زبان میں کمی ہوتی ہے۔ دنیا کی کوئی زبان ایسی نہیں ہے جس میں ترقی کی گنجائش نہ ہو۔ زندہ زبانیں ہمیشہ ترقی کی دوڑ میں رہتی ہیں اور وہ زمانے کی ترقی اور معاشرے کی تشکیل کے ساتھ ساتھ وسعت و

ترقی حاصل کرتی رہتی ہیں۔ اس لیے یہ دلیل کہ اردو میں کمی ہے جس کی بنا پر اردو سائنس کی ترجمان اور ذریعۂ تعلیم بننے کی اہل نہیں ہے، قابل قبول نہیں رہتی۔ کمی کو کون دور کرے گا اور کیسے کرے گا؟ زبان ایسی چیز ہے کہ اس کی کمی خود اس کے بولنے اور لکھنے والے ہی دور کر سکتے ہیں۔ یہ ایسا کام نہیں جو دوسرے ہمارے لیے کر دیں۔ اگر پل بنانا نہیں آتا تو کسی غیر ملک کے ماہرین فن آکر ہمیں پل بنا کر دے سکتے ہیں، لیکن زبان کو ڈھال کر کوئی ہمیں نہیں دے سکتا۔ یہ کام تو ہمیں خود ہی کرنا ہے اور ہم ہی کر سکتے ہیں۔ اگر کام کرنے والوں میں اس علم کی کمی ہو جس علم کی اس کام کے لیے ضرورت ہوتی ہے تو وہ علم تو دوسروں سے حاصل کیا جاسکتا ہے، لیکن اس علم کے لیے بھی زبان ہی ذریعۂ حصول ہوتی ہے۔ وہ زبان اپنی ہی ہونی چاہیے، ورنہ مسئلہ یہ پیدا ہو جاتا ہے کہ پہلے ذریعۂ حصول علم یعنی زبان سیکھو اور پھر علم۔ ظاہر ہے کہ اس میں قوتیں زیادہ صرف ہوتی ہیں، بلکہ ضائع ہوتی ہیں اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نہ علم حاصل ہوتا ہے اور نہ زبان۔ اس طرح یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ علم اپنی قومی اور مادری زبان ہی میں خوبی اور آسانی کے ساتھ حاصل کیا جاسکتا ہے۔

قومی زبان میں جو خامیاں اور کمیاں ہیں وہ بھی اسی طرح دور ہوں گی کہ ہم علوم و سائنس کو اپنی زبان میں پڑھیں اور اپنی ہی زبان میں پڑھائیں۔ اس عمل میں جو دشواریاں پیش آئیں ان کو اپنے علم اور تجربے کی روشنی میں دوسروں کے تجربے سے فائدہ اٹھا کر حل کریں۔

سب سے پہلے سائنسی اصطلاحات کا مسئلہ ہے۔ یہ مسئلہ بہت اہم، نازک اور دقیق ہے۔ ہمیں سائنس پڑھنی اور پڑھانی ہے تو سائنسی اصطلاحات بھی بنانی یا دوسروں سے مستعار لینی ہوں گی۔ بہت سے عام الفاظ کو اصطلاح کا مفہوم اور درجہ بھی دینا ہوگا۔ دوسری زبانوں سے بھی استفادہ کرنا ہوگا۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم دوسری زبانوں کی سائنسی اصطلاحات بجنسہٖ لے لیں۔ ہو سکتا ہے کہ بعض اصطلاحات کو اردو میں ترجمہ کرنے کے بجائے ان کو جوں کا توں ہی استعمال کرنا پڑے۔ اس صورت میں بھی ان اصطلاحات کو اپنی زبان کے مزاج سے صوتی ہم آہنگی دینی پڑے گی۔ اس کے علاوہ وہ اصطلاحات جو بین الاقوامی حیثیت اختیار کر گئی ہیں، ان کو میرے خیال میں جوں

کا توں اپنایا جاسکتا ہے۔ مزید یہ کہ اسلامی ممالک جیسے مصر اور ایران میں اس سلسلے میں جو کام ہوا ہے' اسے بھی پیش نظر رکھنا اور اس سے ہم آہنگی پیدا کرنا مفید ہو سکتا ہے۔

مجھے خوشی ہے کہ اس ضمن میں کراچی یونی ورسٹی میں کام ہو رہا ہے اور ایک مستقل شعبہ اس مقصد کے لیے قائم کر کے کام میں باقاعدگی پیدا کی گئی ہے۔ خلوص اور نظم کے ساتھ کام ہوتا رہا تو مجھے یقین ہے کہ آپ جلد نہیں' کچھ عرصے ہی کے بعد سہی' اس مشکل کام کو پورا کرلیں گے۔

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں کہ یہ مسئلہ نازک اور دقت طلب ہے اور اس میں علمائے سائنس' ماہرین ادب اور اہل زبان کے اشتراک اور دلچسپی کی ضرورت ہے۔ مجھے سائنس' زبان اور اصطلاحات کے مسائل میں کوئی ماہرانہ درک حاصل نہیں ہے۔ جو باتیں میں نے عرض کی ہیں' ان کی حیثیت مشوروں کی ہے۔

یہ دور سائنس کا دور ہے۔ ملک کی بقا و ارتقا کے لیے سائنس سے استفادہ کرنا ضروری ہے۔ سائنس نے اس دور میں جو ترقی کی ہے' اس سے بہت سے مسائل حل ہوگئے ہیں اور بہت سے مسائل پیدا ہوگئے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ زندگی کے اکثر شعبوں اور ملک کے اکثر مسائل میں سائنس کو نظرانداز کرنا ممکن نہیں ہے۔

ادب کا مستقبل

دنیا ہمیشہ سے تغیر پذیر ہے۔ انسانی زندگی اور اس کے فکری رجحانات بھی بدلتے رہتے ہیں۔ آج کا یہ دور جو ہمارے مقدر میں ہے اپنی اس خصوصیت میں نمایاں ہے کہ اس نے تغیر و تبدل کو بہت بڑھا دیا ہے' بلکہ اگر میں یہ کہوں کہ تشویش ناک حد تک بڑھا دیا ہے تو غلط نہ ہوگا۔ سائنس اور رسل و رسائل کی ترقی نے دنیا کی طنابیں کھینچ لیں اور کرۂ ارض سکڑ اور سمٹ کر اتنا مختصر ہوگیا ہے کہ ایک ملک دوسرے ملک سے اور ایک قوم دوسری قوم سے بے نیاز اور غیر متعلق نہیں رہ سکتی۔ نتیجہ یہ ہے کہ کوئی قوم خواہ تیز رفتاری میں دوسری قوموں سے پیچھے ہو' لیکن وہ مجموعی بہاؤ سے خود کو الگ نہیں رکھ سکتی۔ جو افراد یا اقوام اپنے عہد کو سمجھنے میں ذرا پیچھے ہیں ان کو اپنے پاؤں کے نیچے سے زمین نکلتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ اس تیز بہاؤ کا ایک اثر ادب پر بھی پڑ رہا ہے۔ سائنسی پیش رفت خصوصاً ذرائع ابلاغ کی نئی نئی جدتوں اور ایجادوں نے بہت سے لوگوں کو ادب کے مستقبل کی طرف سے مایوس کر دیا ہے۔ ہمارے ملک میں سمعی و بصری ذرائع ابلاغ کے فروغ نے مطالعے کی رہی سہی عادت کو متاثر کیا ہے۔ اس کا ایک پہلو یہ ہے کہ ادبی کتابوں کی فروخت اور بھی کم ہوگئی اور اب ان کتابوں کی اشاعت تقریبات کے سہارے ہو رہی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ہمارے ادب کا مطالعہ اور زیادہ سمٹ جائے گا اور آنے والا کل پاکستانی ادب کے لیے موجودہ حالات سے بھی زیادہ آزمائش کا ہوگا؟ یہ بہت اہم سوال ہے۔ یہ سوال محض ادیبوں کے مستقبل کا ہی نہیں' بلکہ تہذیب کی بقا کا بھی سوال ہے۔ پھر آج جس طرح نئی نسل وی سی آر کے جال میں الجھ گئی اس کے پیش نظر اس سے یہ توقع رکھنا کہ وہ سنجیدہ ادب کے مطالعے کے لیے اپنے وقت اور توانائی کا کوئی حصہ صرف کر سکے گی' شاید زیادہ دانش مندانہ رویہ قرار نہ

دیا جاسکے۔

ہمارا ادب ہماری روایات اور تہذیبی میراث کا امین ہے۔ ہماری تاریخی جدوجہد اور جہادِ آزادی کا رکارڈ ہے۔ ہماری اجتماعی امنگوں اور قومی عزائم کا آئینہ دار ہے۔ ہمارے ماضی، حال اور مستقبل بھی ادب ہی کے ذریعے سے مربوط ہیں اور اس طرح ادب قومی تشخص کا اہم حصہ ہے۔ ہمیں اپنے ادب کے مستقبل کے بارے میں ممکنہ سوالات پر انتہائی دردمندی اور سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے۔

مجھے یقین ہے کہ ہمارے ادیب اردو ادب کے حوالے سے قوم کی رہ نمائی اور خدمت کی طرف توجہ دیتے رہیں گے۔

عہد حاضر کا ادبی، فکری پس منظر

عہد حاضر کے فکری اور ادبی خدو خال کی تشکیل کا سلسلہ سولھویں صدی سے شروع ہوتا ہے جب کوپرنکس نے دریافت کیا کہ زمین ساکن نہیں ہے بلکہ سورج کے گرد چکر لگاتی ہے' نیز یہ کہ زمین کائنات کا مرکز بھی نہیں ہے۔ آگے چل کر گلیلو نے بھی اس خیال کی تصدیق کی' لیکن اس زمانے کے کلیسائی صاحبان اقتدار نے ان سائنسی دریافتوں کو سختی سے کچلنے کی کوشش کی اور وقتی طور پر کچھ کام یابیاں بھی حاصل کیں' لیکن حقیقت کے چہرے پر تادیر پردہ ڈالے رکھنا ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا سائنسی دریافتوں کا جو بیج بویا جاچکا تھا اس سے انکھوے پھوٹے اور پھر تناور درخت بن کر ہر طرف اپنے سائے بکھیرنے لگے۔ یہ سائنسی انقلاب تھا جس نے روایتی فکر کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں۔ مثلاً زمین کی گردش کے مسئلے کے ساتھ جب یہ حقیقت سامنے آئی کہ زمین کائنات کا مرکز نہیں ہے تو زمین کی اہمیت کم ہوگئی اور زمین کی اہمیت میں تخفیف نے انسان کی افضلیت کو بھی معرض خطر میں ڈال دیا اور وہ انسان جسے روایتی فکر کے لحاظ سے اشرف المخلوقات سمجھا جاتا تھا وہ جذباتی طور پر اپنے مرتبے کی بلندی کو متزلزل محسوس کرنے لگا۔

سائنسی انقلاب کے دوش بدوش فکری انقلاب کا سلسلہ بھی مسلسل جاری رہا اور آخر کار ہیگل کے تصور تاریخ تک پہنچ کر نئے تضادات کے دروازے کھلتے نظر آنے لگے۔ ہیگل کے نزدیک انسان تاریخ کی پیداوار ہے۔ ہیگل کا یہ نظریہ انسان کی فردیت پر ایک ضرب کاری تھا' چناں چہ یہ فلسفۂ تاریخ زبردست انتشار کا سبب بنا جس کے نتیجے میں نو ہیگلین مفکرین کے دو مختلف گروپ پیدا ہوگئے۔ ان میں سے ایک گروپ سائنسی فکر کو اپنانے کا قائل تھا جب کہ دوسرا گروپ جذباتی سطح پر اپنے رد عمل کا اظہار کرتا

تھا۔ پہلے گروپ سے متعلق حضرات کا شعار خرد افروزی تھا اور وہ زندگی کو نکھارنے، سنوارنے اور آگے بڑھانے کے ساتھ معاشرے کو بدلنے کے قائل تھے جب کہ دوسرے گروپ کے لوگ معاشرے کو ایک بوجھ قرار دے کر اس سے انکار کرتے تھے اور فرد کی فردیت کو کل حقیقت جانتے تھے۔ مغرب میں اس انداز فکر کے ابتدائی مفکرین میں کرک گار (Kirke Gaare) اور دوستو وسکی وغیرہ شامل ہیں۔

جدید اردو ادب میں بھی فکر کے یہ دونوں دھارے بہتے نظر آتے ہیں۔ پہلے گروپ کے بانی سرسید احمد خاں ہیں، جنھوں نے دانشوری کی ایک نئی روایت کا آغاز کیا۔ دانشوری کی یہ نئی روایت منقولات پر معقولات کو ترجیح دیتی ہے اور شعر و ادب کو زندگی نکھارنے، سنوارنے اور آگے بڑھانے کے عمل میں ممدو معاون تصور کرتی ہے۔ مولانا حالی، محمد حسین آزاد، علامہ شبلی اور ڈپٹی نذیر احمد وغیرہ نے سرسید کا ساتھ دیا اور اردو ادب کو ایک نئی سمت سے آشنا کیا۔ ان سب دانشوروں نے کوشش کی کہ ادب میں زندگی کے مسائل اور معاشرتی کوائف کو تخلیقی آگہی کے ساتھ برتا جائے۔ سرسید اور ان کے رفقا کے عہد کے کچھ ہی عرصے بعد مغربی ادب سے متاثر ہو کر کچھ ادیبوں نے رومانی دبستان کی بھی بنیادیں رکھیں۔ اس رومانی دبستان کے بانیوں میں سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتحپوری، آل احمد سرور وغیرہ شامل تھے۔ مجنوں گورکھپوری کے افسانے بھی اپنی نوعیت میں خالص رومانی ہیں۔

سرسید تحریک سے وابستہ ادیبوں اور ان کے بعد آنے والے رومانی دبستان سے منسلک لکھنے والوں کے یہ دو متوازی دھارے ۱۹۳۶ء میں ترقی پسندوں اور ہیئت پرستوں میں تقسیم ہوگئے۔ ترقی پسندوں کے نمائندہ شاعروں میں فیض احمد فیض، احمدندیم قاسمی، سردار جعفری، کیفی اعظمی، اختر الایمان وغیرہ اور ہیئت پرستوں میں میرا جی اور ن۔م۔ راشد وغیرہ شامل ہیں۔ شاعری میں یہ دونوں دبستان اپنے اپنے طور پر تخلیقی سفر میں مسلسل آگے بڑھتے رہے۔ افسانوی ادب میں ترقی پسندوں کے کارنامے زیادہ نمایاں نظر آتے ہیں، مثلاً احمد ندیم قاسمی، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی۔ ترقی پسند تحریک سے علاحدگی کے باوجود سعادت حسن منٹو کو بھی اپنی نوعیت میں ترقی پسند ہی کہا جائے گا۔ شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ یہ سب افسانہ نگار اردو افسانے کی آبرو ہیں۔

۱۹۶۰ء تک ترقی پسند اور ہیئت پرست دونوں دبستانوں کے ادیب و شاعر اپنی اپنی تخلیقی کاوشوں سے اردو ادب کو زیادہ سے زیادہ وقیع بنانے میں مصروف رہے، لیکن ۱۹۶۰ء سے جدیدیت کے رجحانات کا ضرورت سے زیادہ چرچا ہونے لگا۔ جدیدیت کے علمبردار علامت نگاری، شعور کی رو اور تمثال نگاری وغیرہ اسالیب کو اس انداز سے عام کرنے لگے جیسے عمل تخلیق صرف تکنیک کا نام ہے، معنی و مطلب سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ جدیدیت کے نام سے پیش کی جانے والی بہت سی تحریریں معما بن کر رہ گئیں۔ علامتوں کا استعمال اس انداز سے کیا جانے لگا کہ ان کی معنویت تک پہنچنا بالکل ناممکن ہوگیا جس کی وجہ سے ان تحریروں پر مہملیت کا الزام لگنے لگا۔ علامت نگاری سے بڑھ کر ضد افسانہ (Anti Story) اور ضد شاعری (Anti Poetry) کی تحریکیں بھی شروع ہو گئیں، لیکن مقام شکر ہے کہ اس طرح کے تجربات بہت جلد ناکام ہوگئے اور اب ہمارا ادب از سر نو معنویت کی طرف لوٹ رہا ہے۔ افسانوں میں کہانی اور پلاٹ وغیرہ کی اہمیت اور شاعری میں شعریت کا احساس دوبارہ زور پکڑ رہا ہے جو بلاشبہ ہمارے ادب کے حق میں ایک نیک فال ہے۔

شعر و ادب میں نت نئے تجربے کرنا ادیبوں اور شاعروں کا حق ہے۔ انھیں تجربات کرنے سے روکنا دراصل تخلیقی سوتوں کو خشک کرنے کے مترادف ہے، لیکن ادیبوں اور شاعروں سے یہ توقع ضرور کی جاتی ہے کہ وہ اپنے تجربات کو اپنے تہذیبی مزاج سے الگ کرنے کی کوشش نہ کریں۔

مجھے امید ہے کہ مستقبل میں ہمارے ادیب معاشرے سے منھ پھیر کر صرف فردیت کے گھپ اندھیروں میں ٹامک ٹوئیاں مارنے سے گریز کریں گے اور اپنی تخلیقات کو پورے معاشرے کے لیے بامعنی انبساط اور اجتماعی افادیت کا وسیلہ بنانے کی کوشش کریں گے۔

اردو کے ادبی رسائل

میں انجمن ادبی رسائل پاکستان کا دل سے ممنون ہوں اور متشکر کہ اس نے مجھے اس اہم اجتماع میں شرکت کا موقع عطا فرمایا اور صدارت کی عزت بخشی۔ اہل علم، اہل قلم اوراصحاب ذوق ہماری تہذیبی زندگی کے خوب صورت نقوش ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ملک وملت کے معمار، معاشرے کے ستون اور ملت کے محسن ہیں۔ ان کا کام اچھی زندگی کی تعمیر، معاشرے کی تطہیر اور حسن کی تخلیق ہے۔ یہ اہل قلم ہی ہیں جو ہمیں خیال کے نئے سانچے، فکر کے نئے زاویے اور علم کے نئے راستے عطا کرتے ہیں۔ ان ہی کی تحریروں سے انسان کی عظمت کا احساس اجاگر ہوتا ہے۔ یہی فرد کو اس کے فرائض سے آگاہ کرتے اور معاشرے کو اس کی ذمے داریاں یاد دلاتے ہیں۔ یہی انسانی احساسات و جذبات کی ترجمانی اور سماجی رجحانات کی نمائندگی کرتے ہیں۔

اگرچہ ادب کا عمل سیاست، سائنس اور معیشت کی طرح معاشرے پر راست اثر انداز نہیں ہوتا، لیکن اس کے اثرات غیر مرئی ہوتے ہیں اور ادیب کی عطا کی ہوئی دانش، اس کا تخلیق کردہ احساس حسن اور اس کا پیش کیا ہوا معیار خیر ہر چیز اور ہر عمل میں کارفرما نظر آتا ہے۔ سائنس سے لے کر صنعت تک، تعلیم سے لے کر تجارت تک اور ثقافت سے لے کر سیاست تک ہر شعبۂ زندگی ادب سے متاثر ہوتا ہے اور ادب کا محتاج ہے۔

ادب کو عام آدمی تک پہنچانے کے ذرائع یوں تو اور بھی ہیں اور ان میں کتابیں بہت اہم ہیں، لیکن سب سے پہلا اور عام ذریعہ رسالے ہیں۔ادب کی اشاعت کا اولین مرحلہ رسائل کے ذریعے سے ہی طے ہوتا ہے۔ یہ علمی، ادبی اور فنی رسائل ہی ہیں جو ادیبوں کی فکر و دانش کو تیزی سے سنجیدہ قارئین تک پہنچاتے ہیں۔ ادیب اور قاری

کے درمیان سبک رفتار رابطے کا کردار رسائل ہی انجام دیتے ہیں۔ یہ ایک طرف لکھنے والوں کو سوچنے اور لکھنے پر آمادہ کرتے ہیں تو دوسری طرف پڑھنے والوں کو تازہ بہ تازہ فکری رجحانات سے باخبر رکھتے اور مسائل ملی سے آگاہ کرتے ہیں۔ مسائل کی شدت اور ان کے حل میں حائل مشکلات سے ایک سنجیدہ قاری پوری طرح باخبر ہوتا ہے اور یہ آگہی اس کو اکثر صورتوں میں رسائل ہی کے ذریعے سے حاصل ہوتی ہے۔ رسائل ہی پرانے اور نئے ذہن کے درمیان بعد کو دور کرنے کا ذریعہ ہیں۔ اگرچہ بعض صورتوں میں یہ بعد پھر بھی ظاہر ہوتا ہے' لیکن اگر دونوں طرح کے ذہنوں کے درمیان رسائل کا پل نہ ہو تو شاید مسائل زیادہ سنگین ہو جائیں۔ اسی طرح قدیم و جدید علوم کے تسلسل کو برقرار رکھنے میں بھی رسائل ہی معاون ہوتے ہیں۔

نہ صرف دنیا کی تاریخ میں بلکہ خود برصغیر میں ہم نے دیکھا ہے کہ اصلاح اور بیداری میں رسائل نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ خود تحریک آزادی کا آغاز اور استحکام بھی رسائل ہی کا مرہون منت ہے۔ میں شخصیات کی نفی نہیں کر رہا ہوں۔ اس میں شک نہیں کہ تاریخ ساز رسائل کی پشت پر مضبوط شخصیات کارفرما ہوتی ہیں' لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ ان شخصیات کو منوانے اور مقبول عام کرنے کا کام بھی رسائل ہی انجام دیتے ہیں۔

قومی زندگی کے لیے رسائل کا وجود بہت اہم ہے اس لیے ان کی زندگی کا تحفظ معاشرے پر لازم ہے۔ رسائل کی زندگی اور ترقی کی راہ میں بہت سی چیزیں حائل ہوتی ہیں جن میں عام گرانی' کاغذ کی نایابی' اشتہارات کی کم یابی اور حکومت کی بے التفاتی سے لے کر قاری کی عدم دل چسپی تک مسائل ہی مسائل ہیں۔ ان کا ایک خطرناک بلکہ خوف ناک نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بعض رسائل بددل ہو کر سیدھا راستہ چھوڑ بیٹھتے ہیں۔ ان میں صحت مند بنیادوں کے بجائے محض تجارتی بنیادوں پر باہمی مقابلہ ہونے لگتا ہے اور رسائل کو وہ جامہ پہنانے کی کوشش کی جاتی ہے جس کا الٹا سیدھا نہیں ہوتا۔ ایسے رسائل دیگر علمی' ادبی اور فنی رسائل کے مسائل میں ایک اور مسئلے کا اضافہ کر دیتے ہیں۔ ایسے مایوس و گم کردہ راہ رسائل ادبی رسائل کے رہے سہے قارئین بھی چھیننے شروع کر دیتے ہیں اور قارئین کے ساتھ ساتھ اشتہارات بھی کم ہو جاتے ہیں اور

معاشرے کی بے نیازی میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے، لیکن اطمینان کی بات یہ ہے کہ ادبی دنیا ایسے لوگوں سے خالی نہیں رہتی جو اہل قلم ہونے کے رشتے سے رسائل کے معیار کو برقرار رکھنے میں زندگیاں صرف کر دیتے ہیں۔ ہمارے ملک میں ایسی بہت سی مثالیں مل جائیں گی۔

موجودہ دور میں ہمارے ہاں کتابوں اور رسائل کے مطالعے کا رجحان نہ ہونے کے برابر ہے۔ کتابیں چھپتی ہیں اور گوداموں یا الماریوں کی زینت بنی رہتی ہیں، رسائل اخبارات کے ساتھ ردّی کی نذر ہو جاتے ہیں۔ ان حالات میں بہت کم رسالے اپنی زندگی جاری رکھ سکے اور بہت جلد ناپید ہو گئے۔ جن رسالوں نے خسارے کے سودے کو نباہا وہ سہ ماہی اردو، مخزن، عالم گیر، ہمایوں، نیرنگ خیال، ادبی دنیا، اردوے معلّٰی، زمانہ، نگار، افکار، نقوش، معارف، نیا دور، ماہ نو، فنون، اوراق، ادب لطیف، سیپ اور ساقی کی طرح ادبی روایات کی حیثیت حاصل کر چکے ہیں۔

(چھٹی کل پاکستان کانفرنس، انجمن ادبی رسائل پاکستان۔ ۱۲ اپریل ۱۹۷۴ء)

شعر و سخن سے محبت

عبد الرحمٰن بجنوری نے کہا تھا کہ ہندستان کی الہامی کتابیں دو ہیں : وید اور دیوان غالب۔ کائنات کے جامع فریم میں یہ رائے صائب تھی یا نہیں یہ الگ بات ہے' تاہم محدود و مخصوص معنی میں اسے محض مجذوب کی بڑ نہیں گردانا جاسکتا۔ خود غالب کو اپنے بارے میں یہ زعم تھا کہ اگر بیچ میں بادہ خواری نہ آپڑی ہوتی تو ولی ہوتے۔ مزاج مشرق ہی کچھ ایسا ہے کہ شعرو سخن کی دنیا میں جہاں کسی نے بلندیوں کو چھونا شروع کیا یا تو خود اپنے آپ کو پیغمبر سخن سمجھ بیٹھا ہے یا اس کے مداح اسی رنگ میں عقیدت کے پھول اس پر نچھاور کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ جلال الدین رومی کو دیکھیے۔ قلم کے دھنی تھے' سخن کے یگانہ شہسوار اور فکر و نظر کے بطل عظیم۔ جو کچھ لکھا خوب لکھااور مثنوی میں اپنے جوہر کی جولانیوں کے وہ کمالات دکھائے کہ ہر قاری و سامع کو ہمیشہ کے لیے موہ لیا۔ پھر یہ غلغلہ اٹھا کہ :

ہست قرآں در زبان پہلوی

پیر رومی کی اسی آواز کی بازگشت مرید ہندی کے کلام میں گونجتی ہے اور اس فیضان کا اعتراف اقبال نے برملا کیا ہے۔ اپنی پہچان کا کچھ ایسا ہی ادعا شاہ عبد اللطیف بھٹائی کے ہاں ملتا ہے جو اپنے اشعار کو قرآن کی آیات قرار دیتے ہیں۔ کم و بیش یہی کیفیت رحمان بابا کی ہے۔

مغرب کامعاملہ دوسرا رہا۔ یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ وہاں صوفیانہ شاعری کا سرے سے وجود نہیں ہے' لیکن وہاں کے ادب و شعر کی نمائندہ خصوصیت یہ نہیں۔ شیکسپیئر انگریزی زبان کا تو یقیناً سب سے بڑا شاعر اور ڈراما نگار ہے' لیکن پورے عالمی ادب

میں بھی اس کی حیثیت انتہائی ممتاز ہے اور ادب کی عالمی تاریخ میں کوئی ایسا نہیں جسے شیکسپیئر سے بڑھ کر درجہ دیا جاسکے۔ اس کی نظر سے دیکھا جائے تو شاعر، عاشق اور مجنوں عالم تخیل کی اڑانوں میں ہم صف دکھائی دیتے ہیں۔

بہرحال شاعر کے لیے ناگزیر ہے کہ وہ زندگی کے روزمرہ حقائق کو معنی خیز اور خوب صورت انداز میں پیش کرنے کے لیے تخیل کا سہارا لے۔ تخیل صرف شاعری ہی کی جان نہیں، بلکہ پوری دنیائے ادب کی شان ہے۔ مولانا ابو الکلام آزاد کے نثری سرمائے کا شکوہ اسی صفت پر قائم ہے اور اسی پرشوکت و پروقار کیفیت نے مولانا حسرت موہانی کو بڑی حسرت کے ساتھ یہ کہنے پر مجبور کیا کہ :

جب سے دیکھی ابو الکلام کی نثر
نظم حسرت میں وہ مزہ نہ رہا

بلاشبہ قادر الکلامی وہ ساحری ہے جو دلوں کی کایا پلٹ کر رکھ دیتی ہے، خواہ اس کا پیرایۂ اظہار شعر و شاعری ہو یا نثر۔ شرط یہ ہے کہ جو کچھ کہا جارہا ہے اس کے پیچھے جذبات کی صداقت و فراوانی، فکر کی شاہینی، تخیل کی فلک پیمائی، آرزو کی حیات آفرینی، زندگی کی سوچ، اظہار کی ندرت اور الفاظ کی آراستگی پائی جاتی ہو۔ پھر بات خواہ لالۂ صحرائی کی ہو یا مفلس کی قبائے صد چاک کی، دل کی تہوں تک اتر جائے گی۔ میں نہ تو نرے نالۂ آزاد کا قائل ہوں اور نہ اس روش کو صحیح سمجھتا ہوں کہ پابندی "نے" سرے سے اس کا گلا گھونٹ کر رکھے۔ البتہ توازن و اعتدال کو بھی ایک فریم لازما درکار ہے اور اس ناگزیر ضرورت سے کوئی مفر نہیں۔ ہمارے ہاں ایک زمانہ تھا کہ اردو میں گل و بلبل، خال و دہن اور کاکل و عارض سے آگے بات کم ہی بڑھتی تھی اور شاذو نادر کسی دوسرے ڈگر کی جانب قدم اٹھتا بھی تھا تو تھک ہار کر کہنا پڑتا تھا :

بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

بلاشبہ وہ دور زوال تھا اور اس میں زندگی جس تاریک تنگنائے میں سکڑ کر رہ گئی تھی اسی کا اظہار شعر و سخن میں ہوتا تھا۔ سامراجیت اپنے ساتھ نئے وسائل لے کر آئی اور جواباً آزادی کی لہر اٹھی۔ اس صورت حال سے نمٹنے کے لیے ہمیں ایک طرف سرسید، اکبر، حالی، اقبال، حسرت موہانی، ظفر علی خاں، جوہر، ابوالکلام آزاد اور ابو الاعلیٰ

مودودی نظر آتے ہیں اور دوسری طرف وہ قافلہ ہے جس نے اپنی ترقی پسندی کا اعلان کیا۔ مقصدیت ان دونوں کی قدر مشترک تھی۔ ابو الکلام آزاد اگرچہ بچھڑ گئے، لیکن اصلاً تھے اول الذکر گروہ کے شریک، ادب عالیہ کے عظیم خالق۔

میں یہ کہہ چکا ہوں کہ شعر و سخن کے حسن لازوال کا اظہار اعتدال و توازن کے ساتھ مشروط ہے اور یہ کہ ادبی توازن و اعتدال کو خود ایک اقداری فریم درکار ہوتا ہے۔ حقائق سے گریز و فرار کی راہ پر چلنے کی اگر ٹھان ہی نہ لی گئی ہو تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ پاکستان کی سرزمین پر صرف موزوں، موافق، تاریخی، حیات انگیز اور ترقی پذیر اقداری فریم کی گنجائش ہے اور وہ اقداری فریم صرف اسلام کا نظریاتی نظام مہیا کرتا ہے۔ اب اسے رجعت پسندی کہہ کر استعماری اغراض کی پردہ پوشی نہیں کی جاسکتی۔ اسلام انسانوں کو زندگی، پوری زندگی، حقیقی زندگی کی انسانیت پرور شاہراہ پر گامزن ہونے میں رہبری کرتا ہے اور بے لاگ پر سوزی سے بتاتا ہے کہ عدل و انصاف اور توازن و اعتدال کے ہمہ جہتی تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے انفرادی اور اجتماعی، دینوی اور اخروی فلاح سے ہم کنار ہونا کس طرح ممکن ہے۔

پاکستان میں شعر و سخن کو اس اقداری فریم سے ہم آہنگ کیجیے۔ یہی شعر و سخن سے سچی محبت ہے، اور ہماری صدائے محبت کی یہی لے ہے۔

(شام ہمدرد، پشاور، مورخہ 29 اپریل 1985ء)

اردو نعت

حضورؐ کی بعثت کو چودہ صدیاں گزر گئی ہیں۔ اس سارے عرصے میں آپؐ کی ذات کو جو ارفع ذکر حاصل رہا وہ بجائے خود اسلام کی حقانیت اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایک ایسی شہادت ہے جس کو ساری دنیا تسلیم کرتی ہے۔

آج دنیا کا کوئی حصہ ایسا نہیں جہاں روزانہ پانچ مرتبہ اذان میں اور نماز کے دوران اور دیگر موقعوں پر آپؐ کا نام انتہائی عزت و احترام اور انتہائی محبت کے ساتھ نہ لیا جاتا ہو۔

رفعت ذکر کا یہ ربانی وعدہ اردو ادب کے اس شعری سرمائے کی صورت میں بھی موجود ہے جو حضور رسالت مآبؐ کے حضور ہمیشہ سے پیش کیا جاتا رہا ہے اور جسے نعت کہا جاتا ہے۔

ممتاز شعرا کی روح پرور نعتیں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور حسن عقیدت کے جذبات اور حسن کلام کے نذرانے ہوتی ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ اس بارے میں مختصراً اپنے دوستوں کو وقت کی ایک اہم ضرورت کی جانب توجہ دلاؤں۔

جہاں تک میرا مطالعہ ہے 'ہماری نعتیں بیش تر حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس و اعلا سے اظہار عقیدت و تمنائے قرب کے گرد گھومتی ہیں۔ یہ جذبات بھی بہت ارفع ہیں اور قابل قدر ہیں۔ سرکارؐ کی غلامی کی آرزو زندگی کی بہترین آرزوؤں میں سے ہے' لیکن اگر شعرائے کرام اس میں تھوڑی وسعت پیدا کر کے اردو نعت کو رسمی میلادوں سے ذرا مختلف انداز دیں تو مجھے یقین ہے کہ نعت اصلاح ملت میں زیادہ اہم کردار ادا کر سکے گی۔

یہ تو ہم سب جانتے ہیں کہ حضورؐ کا لایا ہوا دین ایک جامع طریق زندگی ہے جو اپنے

اندر زندگی کے تمام شعبوں کے لیے رہنمائی کاسامان رکھتا ہے۔ قرآن جو آپؐ پر نازل ہوا وہ ہر گوشۂ حیات کے لیے ہدایت پر محیط ہے اور آپؐ کی زندگی قرآن کی بہترین تفسیر ہے۔ آپؐ کے اخلاق کے متعلق جب حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے سوال کیا گیا تو آپؓ نے فرمایا کہ کیا تم نے قرآن نہیں پڑھا؟ جو کچھ قرآن میں ہے وہی آپؐ کے اخلاق ہیں۔

میں جو کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں وہ سیدھے سادے الفاظ میں یہ ہے کہ ہماری نعتوں میں اس اخلاق نبوی کی عکاسی ہونی چاہیے۔ ہمارا دین محض رسمی عبادات کا مجموعہ نہیں ہے اور ایسے انسان پیدا کرنا چاہتا ہے جو دنیا میں امن و راحت اور فلاح و سعادت کے پیامبر کہلائیں۔

ہماری شاعری میں بھی اس کی ترجمانی ہونی چاہیے۔ اگر ہم اپنی نعتوں میں روایتی انداز سے ہٹ کر حضورؐ کی سیرت پاک کو اس طرح پیش کر سکیں کہ اس سے قارئین اور سامعین کو اس اخلاق و کردار کو نمونہ بنانے اور اس کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالنے کی ترغیب ملے تو میرے خیال میں یہ ملت اسلامیہ کی ایک بڑی خدمت ہوگی اور اسی کے ساتھ اردو نعت کو بھی ایک نیا رنگ و آہنگ میسر آئے گا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات پاک میں اتنی وسعت، اتنی بلندی اور اتنی گہرائی ہے کہ اس کا ایک ایک گوشہ شاعری میں ڈھل کر اسلامی انقلاب کا پیش خیمہ بن سکتا ہے۔

(۲ فروری ۱۹۸۱ء)

طبیب اور شاعر

عام دستور اور قاعدے کے مطابق میرا اولین فرض تو یہ ہے کہ میں اس محفل شعر و نغمہ کے منتظمین ذی وقار کا شکریہ ادا کروں کہ ان کی نظر انتخاب نے مجھے اس محفل میں فرائض صدارت ادا کرنے کی عزت بخشی ہے۔ اظہار تشکر کے لیے مناسب الفاظ تلاش کرنے سے پہلے میرا احساس مجھے اس منزل میں لے گیا ہے جہاں پہنچ کر اس قسم کے فخر و انبساط کا جواز معلوم کرنا پڑتا ہے، کیوں کہ بلا شبہ اس ارض پاک میں خصوصاً عروس البلاد کراچی میں بہت سے حضرات مجھ سے زیادہ اہل اور موزوں اس محفل کے لیے ممکن ہو سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی میں نہ تو اپنے آپ کو دیوانہ سمجھتا ہوں کہ محض اس رعایت سے اس قرعۂ فال کو اپنے لیے جائز تصور کروں اور نہ وہ احساس کمتری اپنے اندر پاتا ہوں کہ شاعر کی یہ آواز مجھے سنائی دینے لگے کہ :

آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

اس میں شک نہیں کہ میں خود شعر موزوں کرنے کا سلیقہ اپنے میں نہیں پاتا، لیکن مجالس شعر و سخن میں اٹھ بیٹھ کر اسے سمجھنے کی صلاحیت مجھ میں پیدا ہوگئی ہے۔ اسی طرح نغمہ سازی میرا مشغلہ نہیں، لیکن کبھی کبھار ایسی محفلوں میں دوستوں کی خاطر شریک ہو کر اس فن لطیف سے محظوظ ہونے کا موقع نصیب ہوا ہے۔

یہ صلاحیت و استعداد حق صدارت کے لیے کافی نہیں کہی جاسکتی۔ تاہم بہت غور و فکر کے بعد ارباب محفل شعر و نغمہ اور ایک خادم طب کے مابین کچھ وجہ یگانگت اور قدر مشترک مجھے نظر آہی گئی ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ اس خلش کا علاج بھی اپنے مخزن ادویہ کے بجائے خود ارباب محفل شعر و نغمہ کے کلام بلاغت نظام کی روشنی میں مل گیا ہے۔

شاعر و نغمہ نواز کی دنیا جن عناصر سے مربوط ہے ان میں درد دل، سوزِ جگر، برہمی مزاج، انقباض روح نیز چشم نرگس بیمار اور ویران نگاہیں وغیرہ خاص اہمیت رکھتے ہیں اور ان سب کا علاج طبیب سے ممکن ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس بیماری عشق میں کبھی تو اس کی دوا سے مرض گھٹنے کے بجائے بڑھتا ہے اور کبھی وہ رنگ اثر دکھاتا ہے کہ اسے تیر بہ ہدف کہتے ہیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ کبھی کبھی طبیب کی تشخیص اور شاعر کی تجویز ہم آہنگ ہو جاتی ہیں اور دونوں ایک ہی نسخہ تجویز کرتے ہیں :

پی جس قدر ملے شب مہتاب میں شراب
اس بلغمی مزاج کو گرمی ہی راس ہے

طبیب سے پوچھا جائے تو وہ بھی اسی اصول کو ذرا دوسرے رنگ میں پیش کرے گا۔ وہ مذہبی امتناعات کی رعایت سے شراب نہ سہی، کوئی اور گرم عرق تجویز کر دے گا۔

یہ امر قابل وضاحت ہے کہ جب شاعر کہا جائے تو اس سے مراد عاشق بھی ہوتا ہے۔ وہ دونوں پھول میں بسی ہوئی خوشبو اور اس کی پتیوں سے جھلکنے والے رنگ کی طرح بظاہر الگ الگ، لیکن حقیقتاً آپس میں ایک دوسرے سے وابستہ ہوتے ہیں۔ شاعر کے خیالات کی دنیا حسن و عشق کے امتزاج سے ترکیب پاتی ہے۔ وہ اس کیف و جذب کے عالم میں تخلیق انسان کی غرض و غایت کا کھوج لگاتے ہوئے کہتا ہے :

قالب انساں ازل میں عشق کی خاطر بنا
اس نشیلی مے کے لائق بس یہی پیمانہ تھا

لیکن اگر عاشق کے خیالات کی ترجمانی کرنے والے شاعر کو طب سے ذرا بھی شغف رہا ہے تو وہ غم دنیا سے بچانے کے لیے محبت کرنے کی تلقین کے ساتھ ساتھ محبت کے لطیف نتائج کو ایک آزار یا بیماری ضرور قرار دیتا ہے۔

محبت کر غم دنیا ستائے تو محبت کر
محبت اس جہاں میں اک حسیں آزار ہے ساقی

کبھی کبھی وہ اس آزار کو حسین نہیں سمجھتا، بلکہ خالص طب کی فنی زبان میں طبیب کا نقطۂ نظر واضح کرتا ہے۔ وہ پھولوں سے بلبل کے کاربار کا مذاق اڑوا کر اپنی تشخیص پیش کرتا ہے :

کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

ابتدائی منزل میں اس خلل دماغ کا علاج طبیب کے پاس ہوتا ہے۔ اگر درد حد سے گزر کر خود دوا بن جانے کی منزل میں پہنچ جائے تو طبیب اپنی معذوری کا اظہار و اعتراف کرتا ہے۔ اس وقت سرکاری محکمۂ صحت کے ایک شعبے کے ارباب انتظام اس مریض عشق کی دست گیری کرتے ہیں۔

عاشق کی زندگی میں یہ منزل سب سے زیادہ سخت اور افسوس ناک ہوتی ہے۔ اس پر ترس آنے لگتا ہے۔ دل سے دعا نکلتی ہے :

مریضِ عشق پر رحمت خدا کی

اس موقع پر طبیب کے تاثرات بھی کچھ اس قسم کے ہوتے ہیں۔ وہ بھی دوا کی تاثیر کے ساتھ دعا کی برکت کا قائل ہوتا ہے۔ طبیب بہرحال انسان ہوتا ہے اور سب سے زیادہ وہی انسان کے دکھ درد کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ کبھی کبھی وہ عاشق کی حالت زار کو دیکھ کر خود بھی متاثر ہو جاتا ہے۔ اس منزل میں شاعر کا بیان طبیب کے اعلان سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔ شاعر کہتا ہے :

نہ جانے کون سی شے چشمِ غم گسار میں تھی
کہ جس کو دیکھ کے لرزاں ہوا ہے دستِ طبیب

اگر طبیب اپنے ہاتھ کی اس لرزش کے باوجود صحیح تشخیص مرض کردے اور مریض کو دنیاے محبت سے اجتناب کی تلقین کرنے لگے تو عاشق نامراد جز بز ہو کر اس پر برس پڑتا ہے۔

از سر بالین من برخیز اے ناداں طبیب
نیک و بد سوجھے نہیں جب دل کہیں آجائے ہے

یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ حسن کی جلوہ فرمائیاں اور عشق کی کرشمہ سازیاں اکثر مختلف النوع ہوتی ہیں۔ اس ضمن میں شاعر و طبیب کے نقطہ ہائے نظر ایک دوسرے کے قریب نہیں آتے۔ اگر یہ کیفیات اپنے دائرے میں رہیں یعنی نتائج کے اعتبار سے کام یاب ثابت ہوں تو شاعر منڈھے گاتا، سہرے سناتا اور آخر میں لوریاں الاپتا نظر آتا ہے۔ طبیب کی دنیا میں اس کھیل کے پہلے منظر کی ابتدا اس کے شفا خانے کے اس حصے سے

ہوتی ہے جو زچگی کے لیے مخصوص ہوتا ہے اور انتہا مولودی امکانات کے مطابق اس حصے تک پہنچتی ہے جہاں ضبط تولید کے رموز سمجھا کر بڑھتی ہوئی آبادی پر بند لگانے کی تلقین کی جاتی ہے۔

حسن و عشق کی آمیزشوں کا ایک نیم کامیاب پہلو بھی ہے یعنی عاشق کی عقل وہ نہیں چاہتی جو اس کا دل پسند کرتا ہے۔ شاعر اس کی طرف سے اپنی زبان میں وکالت کرتے ہوئے کہتا ہے :

یارب دعائے وصل نہ ہرگز قبول ہو
پھر دل میں کیا رہے گا جو حسرت نکل گئی

فکر فردا مسلک عشق میں ناروا ہے، لیکن شاعر یہ مناسب سمجھتا ہے بلکہ اسے ایک ترجیحی حیثیت دیتے ہوئے کہتا ہے :

حسن کی اک اک ادا پر جان و دل صدقے مگر
لطف کچھ دامن بچا کر ہی گزر جانے میں ہے

شاعر اس مسلک عشق کو کتنا ہی بلند درجہ دے، طبیب کی نگاہ میں اس کی وقعت نہیں ہوتی، کیوں کہ ایسے عاشق عموماً اس کے مطب میں اپنی نبض دکھا کر اور عرض حال کر کے کچھ رازدارانہ گفت گو کرتے نظر آتے ہیں۔

حسن و عشق کی کیفیات کا دوسرا بالکل متضاد رخ یہ ہے کہ وہ اپنے دائرے کو توڑ کر ہلاکت پسندیوں اور حرماں نصیبیوں میں تبدیل ہو جائیں یعنی نتائج کے اعتبار سے ناکامیوں کا منھ دیکھنا پڑ جائے۔ شدید مایوسیوں کا نقطۂ عروج جس منزل پر پہنچ کر دم لیتا ہے وہ خود کشی کا دائرہ ہوتا ہے اور اس صورت میں طبیب کو عاشق زار کی نعش کا پوسٹ مارٹم کرنا پڑتا ہے۔ طبیب کی دنیا یہاں ختم ہو جاتی ہے۔ عاشق کی منزل اس سے کچھ اور آگے بھی ہوتی ہے، کیوں کہ قبر میں بھی اس کے شانے ہلائے جاتے ہیں۔

شاعر اور طبیب کے مابین ان قریبی تعلقات کے ثابت ہو جانے کے بعد ایک محفل شعر و نغمہ کے لیے ایک خادم طب و جراحت کے انتخاب کا جواز نکل ہی آیا ہے۔ اس لیے صدارت قبول کرنے میں مجھے پس و پیش کا کوئی لطیف حیلہ نظر نہیں آتا۔ جب قبولیت کی منزل آگئی ہو تو اس محفل شعر و نغمہ کے ارباب حل و عقد کا شکریہ ادا کیے بغیر

نہیں رہ سکتا کہ انھوں نے صدارت کے فرائض مجھے سونپ کر واقعی مجھے بڑی عزت بخشی ہے۔

اس محفل شعر و نغمہ کو منعقد کرنے کا ایک اعلا مقصد یہ بھی ہے کہ اس طرح کچھ رقم جمع کر کے ایک شاعر کی مالی اعانت کی جائے جن کے نام کو ظاہر کرنا مناسب نہیں سمجھا گیا ہے۔ تعاون کا صحیح اصول بھی ہمارے ہادی نام دار صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی بتایا ہے کہ دائیں ہاتھ سے اس طرح دو کہ بائیں ہاتھ کو خبر نہ ہو۔ یوں بھی شاعر کی خدمت در حقیقت شعر و ادب کی خدمت ہے اور اس ضمن میں نہ ستائش کی تمنا ہونی چاہیے نہ صلے کی پروا۔ جو کچھ جس سے ہو سکتا ہے حسب استطاعت و توفیق دست تعاون بڑھانے سے دریغ نہ کرے۔

(صدارتی تقریر "محفل شعر و نغمہ" کراچی مورخہ ۲ جون ۱۹۶۲ء)

علاج بالشعر

کسی بات کو خوب صورت الفاظ میں تاثرات و جذبات کے ساتھ بیان کرنا اور اس انداز بیان میں ماحول کی فطری لطافتوں کو سمیٹنا شاعری کی تعریف میں آتا ہے۔ اس لیے اس کا اثر دل و دماغ پر پڑنا لازمی ہے۔ ہر خوب صورتی دراصل شاعری ہے اور فطرت سب سے اعلا شاعر ہے۔ ہر اچھی بات کی طرح شعر و کلام بھی ہمارے اعصاب پر اور نظام جسمانی پر مفید اثر ڈالتے ہیں' اسی لیے ایک مشہور شاعر نے کہ جو پہلے ایک نام ور معالج کی حیثیت سے معروف تھا' شعر و ادب کو دواؤں سے بہتر علاج قرار دیا۔ ڈاکٹر رابرٹ سیمور برجز (۱۸۸۴ء) کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس نے دواؤں اور دوائی طریقۂ علاج یعنی میڈیسن کو ترک کر کے شاعری شروع کر دی اور اسی سے وہ اپنے مریضوں کا علاج کرنے لگا۔ ڈاکٹر برجز نے اپنے لیے ایک بہت انوکھا' نرالا اور تخلیقی راستہ اختیار کیا تھا۔ اس میں وہ کامیاب ہوا۔ اسے ۱۹۱۳ء میں انگلستان کا ملک الشعرا قرار دیا گیا۔ لوگ اس معالج کے اسٹیتھسکوپ سے زیادہ اس کی شاعری سے قریب ہو چکے تھے۔ گویا اب اس کی شاعری زیادہ سے زیادہ لوگوں کے دلوں کی دھڑکن کو چھو لیتی تھی۔ آج بھی اس کی نظمیں حسن اور مسرت کا ایک بڑا عمدہ خزانہ ہیں جن سے اثر پذیر ہو کر لوگ صحت یاب ہوتے ہیں۔

حالیہ ریسرچ نے ثابت کر دیا ہے کہ شاعری معالج کے ذرائع علاج میں سے ایک اہم اور موثر ذریعہ ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ڈاکٹر برجز اپنے وقت سے آگے تھا۔ آج کل شاعری کو موسیقی کی طرح ایک بڑا موثر طریقۂ علاج قرار دیا جاتا ہے اور اسے بہت سے متنوع امراض کے علاج میں اپنایا جاتا ہے مثلاً اعصاب اور دماغ کے امراض سے لے کر دنداں سازی تک۔

شعر و سخن ایسی دوا ہے جو بڑی خاموشی' آہستگی اور سکون کے ساتھ مریض پر اثر کرتی ہے۔ یہ اثر بڑا ہی دیرپا اور مفید ہوتا ہے۔ یہ معالجین کا ایک بہت بڑا نفسیاتی حربہ

بھی ہو سکتی ہے۔ بہرحال شعر و ادب سے تھکے ہوئے دماغوں کو آرام، مضمحل اور منتشر اعصاب کو نئی زندگی اور طاقت، بیمار جسم کو شفا اور نفسیاتی مریضوں کو امید اور مسرت حاصل کرنے میں مدد ملتی ہے۔

مغربی ملکوں میں نفسیاتی معالجین کی ایک نئی کھیپ آگئی ہے جو شعر کہتی ہے، شعر پڑھتی ہے اور اس سے علاج کرتی ہے۔ یہ کہا جارہا ہے کہ ان کے شعر مسکّن اور منوّم دواؤں سے کہیں زیادہ موثر اور بے ضرر ہیں۔ یہی نہیں، بلکہ ان کے علاج بالشعر نے ان مریضوں کو مضر صحت مسکّن اور منوّم دواؤں سے بھی نجات دلا دی ہے۔ بہت سے نفسیاتی ماہرین شیکسپیئر، کیٹس اور شیلے کی خوب صورت اور دل نواز نظموں کے ذریعے سے روز مرہ کی پریشانیوں اور الجھنوں سے مضمحل جسموں اور دماغوں کو تازگی، امیدِ نو اور توانائی عطا کر رہے ہیں۔ وہ ان کو مسکّن کیمیائی دواؤں کے بجائے نہایت بے ضرر اور موثر دوا دے رہے ہیں جس کا اثر مسکّن دواؤں کی طرح کم اثر اور ناپائیدار نہیں، بلکہ یہ "علاج بالشعر" ان کی روح کو نئی بالیدگی، فرحت، امید نو اور قوت دے رہا ہے اور ساتھ ہی ساتھ طویل الاثر ہے، پہلوئی اور دیگر مضر اثرات سے پاک ہے۔ اب یہ ثابت ہو چکا ہے کہ خوب صورت شعر ہر مسکّن دوا سے زیادہ اور بہتر موثر ہے اور لوگوں کو یہ امید نو بھی عطا کرتا ہے، خواہ مریض کسی خطرناک بیماری میں مبتلا ہو مثلاً سرطان جیسی خوف ناک اور بڑی بیماریوں میں مبتلا لوگوں کو اس سے شفا پانے میں مدد ملتی ہے، کیوں کہ وہ مرض کی دہشت، خوف اور مایوسی سے نکل آتے ہیں۔ روزمرہ کی عام تھکن، پریشانی، پستی اور خوف، بلکہ ذہنی اضمحلال تک کا علاج شاعری کے ذریعے سے کیا جاتا ہے۔ یہ دل نواز، نرم، گہری موسیقی کی طرح اثر انگیز ثابت ہوتی ہے اور تازہ دم کر دیتی ہے۔ جن لوگوں پر کام کا بار رہتا ہے او وہ شام کو تھکے ہارے گھروں کو لوٹتے ہیں، ان پر شاعری بڑا لطیف اور خوشگوار اثر کر سکتی ہے۔ بہت سے لوگ دفتروں اور کاربار سے جب گھر لوٹتے ہیں تو وہ اپنے ساتھ پریشانیوں اور افکار کے انبار لاتے ہیں۔ ان کے لیے ہلکی لطیف اور خوب صورت شاعری کس قدر روح افزا اور فرحت بخش ہو سکتی ہے، اس سے انکار کرنا مشکل ہے۔ یہ ان کی روح اور ذہن پر نرم پھوار کی طرح ہوتی ہے۔

برطانیہ میں حالیہ تحقیق سے پتا چلا ہے کہ جو مریض ہسپتالوں میں اشعار پڑھتے رہے

اور ان سے لطف اندوز ہوتے رہے' وہ دوسرے مریضوں کے مقابلے میں بہت جلد صحت یاب ہوگئے۔ امریکا میں شاعری کے شفائی پہلو پر ایک نفسیاتی معالج جیک لیڈی نے خاص توجہ دی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ تیز رفتار صنعتی معاشروں میں ذہنی تھکن' نفسیاتی مسائل اور الجھنیں بہت ہوتی ہیں۔ چناں چہ ان کا حل دواؤں سے ممکن نہیں' بلکہ یہ دماغ کی خاص کیفیات سے مندمل کی جاسکتی ہیں۔ یہ کیفیات موسیقی اور شاعری سے پیدا کی جاسکتی ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق شاعری سے کئی طرح کے اثرات و کیفیات پیدا کیے جاسکتے ہیں' مثلاً :

۱۔ ذہنی آسودگی اور طمانیت کا احساس۔

۲۔ روحانی تسکین مثلاً حرص و ہوس سے نجات۔

۳۔ تنہائی میں رفاقت اور مدد کا احساس۔

۴۔ نفسیاتی امراض میں علاج میں مدد۔

۵۔ خوف اور پستی سے نجات۔

۶۔ قلبی فرحت کے حصول اور جسمانی تھکن دور کرنے میں مدد۔ آرام کا احساس۔

۷۔ امراض کے علاج میں امید شفا۔

۸۔ جرائم پیشہ لوگوں اور منشیات کے عادی لوگوں کی اصلاح۔

اس میں ذرہ برابر شک و شبہ نہیں ہے کہ مشرق نے اپنے زمانۂ عروج میں مغرب کی تاریکیوں کو روشنیاں دی ہیں۔ مشرق علم و حکمت کے ہر میدان میں مغرب پر ضیا پاش ہوا ہے۔ خود مشرق میں جہاں علم و حکمت کے میدانوں میں پیش رفت ہو رہی تھی وہاں شعر و ادب سے مشرق کی فضائیں معطر و معتبر تھیں۔ شعر و سخن کی حسین و جمیل محفلیں برپا ہوتی تھیں۔ شعرا فطری لطافتوں سے سرشار ہو کر فکر و نظر کی عظمتوں اور ضمیر کی رفعتوں سے تعمیر اذہان کا سامان کرتے تھے۔ شعر کی لطافتوں اور سخن کی بلندیوں نے ہر ماحول کو حیات نو بخشی اور فکر انسان کو آمادۂ تعمیر کیا۔ مشرق سربلند رہا اور مشرقی سرفراز۔ مغرب کا اس ماحول سے متاثر ہونا یقینی تھا اور ایسا ہوا۔

ایک امریکی رسالے کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ دل چسپ حقائق میرے سامنے آئے کہ اب مغرب نے علاج بالشعر کے میدان میں پیش رفت کی ہے۔

مغربی ملکوں میں کئی جگہ، جیل خانوں، دماغی امراض کے ہسپتالوں، منشیات کے عادی لوگوں کی اصلاح اور بحالی کے مرکزوں اور نفسیاتی علاج گاہوں میں شعروسخن کے ذریعے سے مریضوں کے حقائق کو تسلیم کرنے میں اور صحت مند ہونے میں مدد لی گئی ہے۔

شعر و سخن بے چین، مضطرب، داخلی ذہنی کرب کے نکاس اور اظہار کا سب سے موثر ذریعہ ہے۔ اسی طرح یہ مجرم ضمیر کے اعتراف جرم کا بھی ایک اعلا ذریعہ ہے۔ وہ اگر اصلاح ذات نہ بھی کر سکے تو کم از کم ذہنی کرب اور عذاب سے نکل جاتا ہے۔ علاج بالشعر کی ایک حامی، جوت شیمن جو کیلے فورنیا میں الکامینو ہسپتال میں پوئٹری تھیراپی کی ڈائریکٹر ہے، کہتی ہے کہ شاعری انسانوں کے درمیان حائل دیواروں کو توڑ دیتی ہے اور ہر شخص کا اندرونی احساس ظاہر ہو جاتا ہے۔ اس نے ذہنی مریضوں، قیدیوں اور مجرموں پر کئی تجربات کیے۔ اس نے ان کو کلام شعرا پڑھنے کو دیا یا ان کو نظمیں سنائیں۔ چناں چہ وہ سچ بول پڑے یا ان پر جو بھی رد عمل ہوا، اس سے ان کی ذہنی و نفسیاتی کیفیت عیاں ہو گئی۔ وہ کہتی ہے کہ شاعری غم زدہ لوگوں کا سب سے موثر علاج ہے۔ وہ لورین ایزلی جو موقر سائنس داں بھی تھا، کی ایک نظم "شیر کی دوستی" کا حوالہ دیتی ہے۔ اس نظم میں ایزلی بچپن کے ایک کھلونے کے شیر کا ذکر کرتا ہے اور اعتراف کرتا ہے کہ اگرچہ وہ بڑا ہو کر سائنس داں بنا ہے، لیکن اس کا یہ پرانا کھلونا اسے ایک بار پھر ماضی کے معصوم بچپن میں لے جاتا ہے اور اسے اس شیر کی بٹن سے بنی آنکھیں گھور کر دیکھتی ہیں اور کہتی ہیں کہ ہم اب بھی انسان ہیں۔ جوت شیمن کہتی ہے کہ اس طرح شاعری انسان کو خود پر نظر ثانی کا موقع فراہم کرتی ہے۔

ایک ڈاکٹر شریون کا کہنا ہے کہ جن ذہنی مریضوں اور مجرموں کو کلام شعرا پڑھنے کو دیا گیا وہ اس سے تنہائی میں اس قدر متاثر ہوئے کہ انھوں نے لوگوں کو اپنا ہم راز بنا لیا اور اپنے ذہنی کرب کو اُگل دیا۔ ان میں سے بعض نے خود بھی نظمیں لکھیں جن میں ان کے داخلی احساسات کا پرتو تھا۔ امریکی ریاست کینٹکی کی سماجی کارکن میسی سمن کو پتا چلا کہ اسے چھاتی کا سرطان ہے۔ ہسپتال میں آپریشن ہوئے اور اسے دل بہلانے کو کتابیں پڑھنے کو دی گئیں۔ اس نے نظمیں اور غزلیں پڑھیں اور اس قدر متاثر ہوئی کہ کچھ دن بعد خود نظمیں لکھنے لگی۔ اس سے اس کی توجہ اس کے درد اور آپریشن کے بعد

کی تکالیف سے کافی حد تک ہٹ گئی۔ مریضہ کا کہنا ہے کہ چند ماہ بعد اس نے اندازہ لگایا کہ اس کا اصل مسئلہ جسمانی نہیں، بلکہ ذہنی تھا۔ وہ موت کے خوف میں مبتلا تھی۔ اس عرصے میں جب اس نے نظمیں و غزلیں پڑھیں تو اسے زندگی اور موت کا فلسفہ سمجھ میں آیا۔ رفتہ رفتہ اس کے دل سے خوف اور تشویش جاتی رہی اور وہ کافی حد تک نڈر اور پر اعتماد ہو گئی۔ چناں چہ دوسرے آپریشن کے وقت اس کے ذہن میں کوئی خوف نہیں تھا، بلکہ وہ اپنے پسندیدہ اشعار دل ہی دل میں پڑھ رہی تھی۔ اس کا کہنا ہے کہ ان اشعار نے اس میں ایک طرح سے درد سے بچانے اور سُن کرنے کا احساس پیدا کر دیا۔
بروکلین میں بھی ایک سرجن نے یہی کام یاب تجربہ کیا۔ اس کے مریضوں کو شعرو سخن کے مطالعے سے امید اور اعتماد پیدا ہوا۔ بعض جگہ معالج یہ صحیح رویہ اختیار کر رہے ہیں کہ وہ اپنے مریضوں کے کمرۂ انتظار میں شعرو کلام پر مشتمل کتابیں رکھ دیتے ہیں جن کے مطالعے سے ان کی بوریت اور بے چینی دور ہو جاتی ہے۔

ہم اپنے ماضی کے کسی بھی دور میں جھانکیں، ہمیں شعرو سخن کی جاں بخش اور خوش بو دار فضاؤں سے سابقہ پڑتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ فکر ملت میں انقلابات برپا کرنے کے علی الرغم مشرق میں شعرو سخن نے لذتوں اور راحتوں کا بھی سامان کیا ہے اور عظمت مشرق سے اس کا گہرا تعلق رہا ہے۔

ہم آج جن مخصوص حالات سے گزر رہے ہیں، ان سے عہدہ برآ ہونے کے لیے شعرو ادب سے مدد لینا ایک صحیح پیش رفت قرار دیا جائے گا۔ حتیٰ کہ ہم پاکستان میں سیاسی استحکام سے لے کر معاشرے میں اضمحلال اخلاق اور حیا سوز حالات کی اصلاح کا سامان بھی شعرو سخن سے کر سکتے ہیں۔ قوم کے عصبی تشنجات کا علاج بھی اس سے ممکن ہے۔ ہمیں اس کے لیے زمین پر اترنا ہوگا اور اہل علم و فن اور علم و ادب سے محبت و احترام کا رویہ اختیار کرنا ہوگا۔

ڈپریشن اور شعروشاعری

زمانہ بڑی تیزی کے ساتھ کروٹیں بدل رہا ہے۔ ایک مرض جارہا ہے' دوسرا آرہا ہے۔ ایک تحقیق رد ہو رہی ہے' اس کی جگہ نئی تحقیق لے رہی ہے۔ ہوائیں بدل رہی ہیں' نئی فضائیں قائم ہو رہی ہیں۔ انسان ماحولیات سے دوچار ہے۔ آلودگیوں سے ہم کنار ہے' آب و ہوا کی آلودگیاں' معاشرے کی آلودگیاں' سیاسی آلودگیاں وغیرہ۔ اس صورت حال نے ایک نئے مرض کو وجود دیا ہے۔ اس کا نام ڈپریشن ہے۔ ہم اس کو اردو میں پستی یا اضمحلال یا افسردگی کہہ سکتے ہیں۔

ڈپریشن کے مظاہر متعدد ہیں اور متنوع۔ جس طرح ڈپریشن کے مریضوں کی کثرت ہے' اسی طرح اس کے مظاہر بھی بکثرت ہیں :

☆ خوف۔ زندہ رہنے سے خوف اور زندہ رہنے دینے سے خوف۔

☆ ایک ان جانا ڈر

☆ اختلاج قلب۔ ہاتھوں پیروں میں رعشہ و لرزش

☆ نیند کا غائب ہو جانا

☆ شدید غصہ

☆ قتل و غارت پر آمادگی ہمہ وقت

☆ قوت فیصلہ کا عدم

☆ کام کرنے کی اہلیت ختم

اسباب ڈپریشن ایک معالج کی نگاہ میں یہ ہیں :

☆ عصبی نظام کا اختلال

☆ عناصر اربعہ اور اخلاط اربعہ میں عدم توازن

☆ غدود ہائے غیر ناقلہ کی رطوبتوں کے رساؤ میں خلل

☆ اعضائے رئیسہ و شریفہ کا اضمحلال

☆ قوت فکر اور قوت فیصلہ میں تصادم

پاکستان ایک ایسا ملک ہے جس کے باشندے سب سے زیادہ ڈپریشن میں مبتلا ہیں، مگر یہ مسئلہ عالم گیر صورت اختیار کرتا چلا جا رہا ہے۔ اس کے سیاسی اسباب ہیں :

☆ سیاسی انتشار و افتراق جس نے ضمیر انسان کو کچل کر رکھ دیا ہے اور فکر انسانی کو مفلوج کر دیا ہے۔

☆ ہیئت اقتدار اور ہیئت اختلاف کے مابین آویزشیں

☆ عدم مساوات، غربت اور دولت کی انتہائیں۔

☆ سیاست، صحافت اور امامت کا صراط مستقیم چھوڑ دینا

☆ سیاست کو علم و حکمت سے غیر متعلق کر دینا

☆ اہل سیاست کی ذخیرہ اندوزیاں۔ دولتوں کی فراوانیاں

☆ اضمحلال اخلاق

☆ انسان سوزیاں

ڈپریشن کا علاج پاکستان میں آج منوّمات، مسکّنات اور مخدّرات سے کیا جارہا ہے۔ ان دواؤں کا پاکستان اس وقت سب سے بڑا درآمد کنندہ ہے۔

ایک ہسپتال کے افتتاح کے موقع پر اسباب و علاج کی بحث جاری تھی۔ میں نے صدارتی خطبے میں یہ کہا کہ ڈپریشن کا علاج مسکن اور منوم اور مخدر دوائیں نہیں ہو سکتیں۔ ڈپریشن کا سب سے بڑا سبب تسلیم شکست ہے یعنی انسان اپنی قوت مدافعت کو بیدار کرنے میں جب ناکام ہو جاتا ہے تو وہ حالات پیش آمدہ کا مقابلہ نہیں کر سکتا اور شکست تسلیم کر لیتا ہے اور ڈپریشن میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ تسلیم شکست ہی ڈپریشن کا دوسرا نام ہے۔

میں نے یہ تمہید اس لیے باندھی ہے کہ میں ڈپریشن کے بارے میں تازہ ترین علاج سے آپ کو باخبر کرنا چاہتا ہوں۔

انگلستان سے تازہ ترین خبر یہ آئی ہے کہ ڈپریشن کا علاج شعر و شاعری سے کرنا

چاہیے۔ وہاں ماہرین نے اس طرف توجہ شروع کر دی ہے۔ اٹلی کے عظیم شاعر و رجل دانتے کا ایک شعری پروگرام روزانہ روم ٹیلے وژن پر آ رہا ہے۔ کہا گیا ہے کہ تسکین اعصاب کے لیے شعر و شاعری بہترین علاج ہے۔

یہ لوگ تو آج سوچ رہے ہیں۔ میں نے تو ۱۹۹۳ء میں یہ علاج تجویز کر دیا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ آج کے پروگرام کی غایت میں نے آپ کو بتا دی ہے۔

(کلمات ابتدائیہ' شام ہمدرد' کراچی' ۱۴ اپریل ۱۹۹۴ء)

اردو زبان میں ہائیکو مشاعرے

تہذیبی لین دین اور تبادل افکار تازہ ہوا کے جھونکے کے مانند ہوتا ہے۔ جو قومیں دوسری قوموں کے ذہنی، علمی، ادبی اور فنی تجربات سے فائدہ اٹھانے کے لیے اپنے دل و دماغ کے دریچوں کو وا رکھتی ہیں ان کی تخلیقی صلاحیتیں لامحدود امکانات کو چھو لیتی ہیں۔ ادب میں ہم نے مغربی افکار و اصناف سے استفادے میں بخل سے کام نہیں لیا اور نقصان میں نہیں رہے۔ حکمت کو ہم عقیدۃً بھی اپنی گم شدہ میراث سمجھتے ہیں اور جہاں ملے، جس سے ملے اس کو موتی سمجھ کر چن لیتے ہیں۔ یونان کی حکمت یعنی طب اور فلسفہ دونوں کو ہم نے دونوں ہاتھوں سے سمیٹا، اپنایا، بڑھایا اور پھیلایا۔ عربی، فارسی، ہندی، انگریزی اور فرانسیسی زبانوں سے اخذ واکتساب کا سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ کم سے کم جہاں تک دینی موضوعات کا تعلق ہے اردو کسی زبان سے پیچھے نہیں ہے، لیکن اس علمی لین دین میں اجتماعی مزاج کی اہمیت کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ جو فکر اور جو صنف ہمارے اجتماعی مزاج کو قبول نہ ہو وہ ہمارے ادب میں جگہ نہیں پاسکتی۔ ہم نے مغربی ادب کی جن اصناف کو اختیار کیا ان میں بھی اپنے آپ کو ضرور شامل کیا۔ جو صنف یا جو ہیئت اس مزاج میں نہ ڈھل سکی وہ کچھ عرصے شور مچا کر ٹھنڈی ہوگئی۔

آج کل ہائیکو کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے ہمیں بھی یہی احساس ہوتا ہے کہ یہ بھی باہمی لین دین کی ایک کڑی ہے۔

ہر قوم کا ادب اس کے تصور حقیقت اور اس کے اجتماعی تہذیبی مزاج کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر اردو شاعری میں غزل کی صنف میں جو رمزیت و ایمائیت کی چاشنی نظر آتی ہے وہ تصوف سے ہمارے گہرے شغف کی مظہر ہے۔ اسی طرح جاپانی زبان میں ہائیکو کی مقبولیت جاپانی قوم کے تہذیبی مزاج کی آئینہ دار ہے۔

جاپان کے لوگ پھولوں سے گہرا شغف رکھتے ہیں۔ ان کے گھروں کی تزئین و آرائش میں پھولوں کو جو اہمیت حاصل ہے وہ ان کے ذوق جمال کی آئینہ دار ہے۔ رنگوں کے امتزاج و تضاد سے حسن پیدا کرنے کا انھیں خاص سلیقہ آتا ہے۔ پھولوں کی رنگت، نزاکت اور لطافت جاپانیوں کے احساس جمال کو مزید ابھارتی اور نکھارتی ہے۔ ان کا یہ اجتماعی ذوق ان کی شاعری میں بھی نظر آتا ہے۔ ہائیکو کا موضوع بھی موسم بہار کی کیف سامانیوں اور پھولوں کی شادابیوں سے متعلق ہے۔ اس لحاظ سے ہائیکو کو یکسر جمالیاتی شاعری کہا جاسکتا ہے۔ تین مصرعوں پر مشتمل ہونے کے باوجود یہ مثلث اور ثلاثی سے مختلف ہے، بلکہ یہ جاپانی شاعری کی ایک صنف سن رائی یو (SENRYO) سے بھی مختلف ہے جس میں مصرعوں کی تعداد تو تین ہی ہوتی ہے، لیکن اس کا مزاج ہائیکو سے بالکل مختلف ہے۔

ہائیکو تین مصرعوں پر مشتمل ایک مکمل نظم ہوتی ہے۔ ان تین مصرعوں میں پہلا مصرع پانچ ارکان، دوسرا سات ارکان اور تیسرا پھر پانچ ارکان کا ہوتا ہے۔ جاپانی شاعری میں ارکان ہمارے عروضی قاعدے کے برخلاف پنگل اور انگریزی "سلی بل" کے مماثل ہوتے ہیں۔ ساخت کے اس فرق کے علاوہ موضوع کے اعتبار سے ہائیکو میں بالعموم مناظر فطرت اور اطراف میں پائے جانے والے جانوروں کا ذکر ہوتا ہے۔ اس کا یہ مطلب ہوا کہ اردو شاعری کا جوہر مابعد الطبیعیاتی موضوعات اور جاپانی شاعری کی بنیاد طبیعیاتی موضوعات ہیں۔

اردو اور جاپانی شاعری کے بنیادی اختلاف کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ مختلف تہذیبوں کے درمیان لین دین کا عمل ہمیشہ جاری رہتا ہے اور اس تہذیبی لین دین کے نتیجے میں انسانی تہذیب کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔ ہرچند یہ ایک حقیقت ہے کہ اردو کے تہذیبی مزاج میں مابعد الطبیعیاتی رنگ غالب ہے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اردو میں مناظر فطرت یا طبیعیاتی موضوعات کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔ اردو میں قصائد کی تشبیب اور مرثیوں کے چہروں میں مناظر فطرت کی نہایت عمدگی سے تصویر کشی کی گئی ہے۔ اس تصویر کشی کو محاکات کا نام دیا جاتا ہے۔ البتہ قصائد اور مراثی کی منظر کشی میں اس اختصار سے کام نہیں لیا جاتا جو جاپانی زبان میں ہائیکو کا لازمی حصہ ہے۔

اردو زبان کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ مختلف زبانوں کے الفاظ اور اصناف کو نہایت خوبصورتی سے اپنا لیتی ہے جس کی مثال اردو زبان میں انگریزی زبان کی اصناف نظم آزاد اور نظم معرا کا استعمال ہے۔

اردو شاعروں نے ہائیکو کی صنف کو اپنا کر اردو شاعری میں نئے اسالیب کی طرح ڈالی۔ بعض شعرا کے تو ہائیکو مجموعے بھی زیرِ اشاعت ہیں۔ ہمارے بعض ادبی رسائل بھی ہائیکو کو مستقل عنوان بناتے ہیں۔ جاپانی کونسل کی طرف سے منعقد اردو زبان میں ہائیکو کے مشاعروں میں اردو شعرا طبع زاد ہائیکو تصنیف کرنے کے علاوہ جاپان کے شعرا کی ہائیکو نظموں کے اردو میں منظوم ترجمے بھی پیش کرتے ہیں۔ جاپان ثقافتی مرکز نے تین ہائیکو مشاعروں کے جو گل دستے شائع کیے ہیں ان سے بھی ہمارے شاعروں کی ہائیکو میں گہری دل چسپی کا اظہار ہوتا ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہائیکو میں طبع آزمائی کرنے والوں میں پرانی اور نئی نسل دونوں کے شعرا شامل ہیں۔ بلاشبہ یہ سرمایہ اردو میں فنی تجربے کی حیثیت رکھتا ہے جس میں ہائیکو کے فنی تقاضوں کی ممکنہ تکمیل کے ساتھ ساتھ پاکستانی ادب اور اردو زبان کا مزاج بھی شامل ہے۔

شروع شروع میں اردو شعرا کی یہ نظمیں فنی لحاظ سے کم زور تھیں، لیکن رفتہ رفتہ اردو شعرا نے فنی کم زوریوں کو بہت بڑی حد تک دور کر لیا ہے۔ اس سلسلے میں شان الحق حقی، رسا چغتائی اور محسن بھوپالی کی ہائیکو نظمیں خاص طور پر پیش کی جاسکتی ہیں جن میں فن کے تقاضے بطریق احسن پورے کیے جاتے ہیں۔

جاپانی ہائیکو کی ساخت اور اس کے ارکان کی شرائط صرف اس صورت میں پوری کی جاسکتی ہیں جب ہمارے شعرا صرف "فعلن فعلن" ہی کے وزن کو اختیار کریں، کیوں کہ ہمارے ہاں "فعلن فعلن" واحد ارکان ہیں جو جاپانی ہائیکو کے ارکان کے عین مطابق ہیں۔

مجھے یہ کہتے ہوئے بڑی خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ ہمارے ہاں بہت سے شعرا نے ہائیکو لکھنے میں بڑی مہارت حاصل کر لی ہے اور اب ہائیکو کا استعمال اردو شاعری میں بڑے پیمانے پر ہو رہا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہائیکو اردو شاعری کی ایک مستقل صنف کی صورت اختیار کر گئی ہے۔ بلاشبہ ہماری شاعری میں یہ ایک خوشگوار اضافہ ہے۔

اقبال فہمی

علامہ ڈاکٹر محمد اقبال رحمتہ اللہ علیہ مسلم امہ کے ان اکابر میں سے ہیں جن کے افکار نے مسلمانوں کو بیدار کیا اور ان کو ایک غیرت مند قوم کی حیثیت سے زندہ رہنے کا درس دیا۔ علامہ کا کلام خودی کا پیغام ہے اور ہمیں ایک خود دار ملت کی حیثیت سے اقوام عالم میں اپنا کردار ادا کرنے کی تلقین کرتا ہے۔

انیسویں صدی کے ربع آخر میں مسلمانوں نے متعدد عظیم رہبر اور دانشور پیدا کیے جنھوں نے غلامی میں جکڑی ہوئی قوم کو پیام حیات دیا اور اپنی فکر اور جدوجہد سے عمل کی روح پھونکی۔ سرسید' مولانا حسرت موہانی' مولانا محمد علی جوہر' مولانا ظفر علی خاں کے علاوہ قائد اعظم محمد علی جناح اور علامہ اقبال جیسی عظیم شخصیات کی بے مثال فکری قیادت' مدبرانہ سیاست اور بے مثال قربانیوں نے ہمیں حریت فکر سے آشنا کیا اور وہ شعور بخشا جس کے نتیجے میں ہمیں آزادی جیسی بیش بہا دولت میسر آئی۔

آزادی دراصل ان ہی بزرگوں کا عطیہ ہے اور اس عطیے کی قدر کرنا ہمارا فرض ہے۔ ہم آزادی کی قدر اس طرح کر سکتے ہیں کہ ہم آزاد پاکستان کو ان مقاصد سے ہم آہنگ رکھیں جو قائد اعظم اور علامہ اقبال نے متعین فرمائے تھے۔

اہل علم و قلم نے علامہ اقبال اور ان کے افکار و اشعار پر نہایت عالمانہ روشنی ڈالی ہے۔ میں نے بھی چند اشعار کی روشنی میں علامہ کے افکار کو سمجھنے کی کوشش کی ہے جن کو اختصار کے ساتھ پیش کرتا ہوں۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں :

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

اس شعر میں قہاری سے مراد غلبہ حاصل کرنے کی استعداد اور غفاری سے مراد

معاف کرنے یا درگزر سے کام لینے کا شعار ہے۔ قدوسی کا مطلب پاک نہاد و پاک صفات ہونا ہے جب کہ جبروت تصوف کی اصطلاح ہے جو عظمت و جلال کے حامل عالم کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ ان الفاظ واصطلاحات کے پیش نظر اس شعر کی تشریح کرتے ہوئے یہ بات بجا طور پر کہی جاسکتی ہے کہ علامہ اقبال کے نزدیک مسلمان وہ ہے جو غلبہ پانے کی صلاحیت اور معاف کرنے یا درگزر سے کام لینے کا شعار رکھتا ہو اور اس کے ساتھ ساتھ پاک نہاد ہونے کی صفت اور عظمت و جلال سے آراستہ علم سے بھی بہرہ ور ہو یعنی ایک مسلمان کے عناصر ترکیبی میں قہاری، غفاری، قدوسی اور جبروت جیسی اقدار شامل ہوتی ہیں اور یہی وہ اقدار ہیں جنھیں ایک سچے مسلمان کی پہچان کہا جاسکتا ہے۔

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

صحابۂ کرامؓ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ دوستوں کے درمیان ریشم کی طرح نرم ہوتے تھے جب کہ حق و باطل کے معرکے میں فولاد کی طرح سخت نظر آتے تھے۔ علامہ اقبال نے صحابہؓ کی اس خصوصیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا ہے کہ ایک سچا مسلمان اپنے دوستوں کے درمیان نہایت نرم خو ہوتا ہے جب کہ معرکۂ حق و باطل میں فولاد کی طرح سخت نظر آتا ہے یعنی وہ حق کو قائم کرنے اور باطل کو مٹانے میں کسی مصلحت سے کام نہیں لیتا، ایسے موقع پر ثابت قدم رہنا اس کا شعار ہے۔

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

اس شعر میں علامہ نے قرآن پاک کی ان آیات کے حوالے سے مسلمان کی تعریف کی ہے جن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اس نے انسان کو زمین پر اپنا خلیفہ بنا کر بھیجا ہے اور یہ پوری کائنات اس کے لیے مسخر کر دی گئی ہے۔ علامہ کے نزدیک مسلمان اسی فرد کو کہا جاسکتا ہے جو ان آیات کی معرفت رکھتا ہو اور سمجھتا ہو کہ اسے یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ اس کائنات کی تسخیر کر کے اس پر حکمرانی کرے۔ اس کے قلب پر یہ حقیقت پوری طرح روشن ہو کہ اللہ تعالیٰ نے یہ کائنات اس کے لیے پیدا کی ہے نہ یہ کہ اسے کائنات کے لیے بنایا ہے۔ قرآن پاک میں بیان کی گئی اس حقیقت کے مطابق

علامہ فرماتے ہیں کہ کافر کی یہ پہچان ہے کہ وہ اس دنیا کی آسائشوں اور دل فریبیوں پر نظریں جمائے رکھتا ہے اور خود کو اس دنیا میں گم کر دیتا ہے جب کہ ایک مسلمان اس کائنات کو مسخر کرکے اس پر حکمرانی کرتا ہے یعنی کافر خود کو اس دنیا میں گم کیے رکھتا ہے جب کہ مسلمان کے وجود میں یہ دنیا خود گم ہو کر رہ جاتی ہے۔

قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے
دنیا میں بھی میزان قیامت میں بھی میزان

ایک سچے مسلمان کی عظمت کی وضاحت کرتے ہوئے علامہ اقبال کہتے ہیں کہ سچے مسلمان کے ارادے قدرت کے مقاصد کی کسوٹی ہوتے ہیں یعنی اس کا عمل قدرت کے تقاضوں کے عین مطابق ہوتا ہے جس سے اسے اس دنیا میں سرخروئی حاصل ہوتی ہے اور آخرت میں بھی اسے عزت نصیب ہوتی ہے۔ لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایک سچے مسلمان کے اعمال دنیا اور آخرت دونوں جگہ حق و صداقت کی کسوٹی یا میزان کی حیثیت رکھتے ہیں۔

نہ تو زمیں کے لیے ہے نہ آسماں کے لیے
جہاں ہے تیرے لیے تو نہیں جہاں کے لیے

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی مثال پر خلق کیا ہے اور اس میں اپنی روح پھونکی ہے۔ اس عظمت کے ساتھ اسے زمین پر اپنا خلیفہ بنا کر بھیجا ہے اور یہ پوری کائنات اس کے لیے خلق کی ہے تاکہ وہ اس سے متمتع ہو سکے۔ علامہ نے اس امر کو سامنے رکھتے ہوئے بتایا ہے کہ انسان کو نہ زمین کے لیے بنایا گیا ہے اور نہ آسمان کے لیے، بلکہ اس کے برعکس یہ پورا جہان اس کے لیے خلق کیا گیا ہے۔ اس شعر میں زیرلب بتایا گیا ہے کہ وہ لوگ جو اس دنیا ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں اور دنیاوی آسائشوں کے حصول کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر دیتے ہیں وہ سخت خسارے کا سودا کرتے ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ جس دنیا کو حاصل کرنا ان کا مطمح نظر ہے وہ تو اس کے مالک و حاکم ہیں۔ کیسی ناسمجھی کی بات ہے کہ انسان اپنی ہی ملکیت کا غلام بن کر رہ جائے۔

عرشِ معلّٰی سے کم سینۂ آدم نہیں
گرچہ کفِ خاک کی حد ہے سپہرِ کبود

اللہ تعالیٰ انسان کی رگ جاں سے بھی زیادہ قریب ہے اور ایسا انسان جو معرفت ذات سے بہرہ ور ہوتا ہے اس کا دل نور الٰہی سے منور رہتا ہے۔ نور الٰہی سے منور دل کی اہمیت کو عرش معلی سے تعبیر کرنا کچھ غلط نہیں ہے' لیکن وہ انسان جو اپنی ذات کے عرفان سے عاری ہے اس کی حیثیت مٹھی بھر خاک سے زیادہ نہیں جو صرف زیر آسمان دنیا تک ہی محدود ہے۔

ترى زندگی اسی سے' تری آبرو اسی سے
جو رہی خودی تو شاہی نہ رہی تو روسیاہی

علامہ اقبال کا پورا فلسفہ خودی دراصل انسان کو ودیعت کردہ امکانات پر روشنی ڈالتا ہے اور بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو زبردست امکانات سے نوازا ہے۔ چناں چہ اس پر لازم ہے کہ وہ ان امکانات کی آگہی حاصل کرے اور پھر ان امکانات کو بروئے کار لاکر دنیا پر حکومت کرے۔ علامہ کہتے ہیں کہ انسان کی زندگی صحیح معنی میں زندگی کہلانے کی مستحق اسی وقت ہو سکتی ہے جب وہ اپنی خودی یعنی اپنے اندر ودیعت کیے ہوئے امکانات سے باخبر بھی ہو اور اپنی خودی کی حفاظت بھی کرے۔ اپنی خودی سے آگہی اور اس کی حفاظت انسان کی عزت و آبرو کی شرط اول ہے۔

لفظ اسلام سے یورپ کو اگر کد ہے تو خیر
دوسرا نام اسی دین کا ہے فقر غیور

اقبال کے نزدیک اسلام فقر غیور ہی کا ایک نام ہے یعنی فقر اور غیرت دو ایسی قدریں ہیں جنھیں اسلام کی شناخت کہہ سکتے ہیں۔ فقر سے مراد یہ نہیں ہے کہ انسان ترک دنیا کرکے رہبانیت اختیار کرلے' بلکہ فقر سے مراد دنیاوی سود و زیاں سے بلند ہو جانے کا مسلک ہے۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے موتی پانی میں رہ کر بھی خشک رہتا ہے۔ اسی طرح مسلک فقر پر گامزن افراد ہر طرح کی معاشی و معاشرتی سرگرمیوں کی انجام دہی کے باوجود یہاں کے سود و زیاں سے بے نیاز ہوتے ہیں۔ وہ عمل کی حد تک تو فعال ضرور ہوتے ہیں' لیکن عمل کے نتیجے کو اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دیتے ہیں جس کی وجہ سے وہ نہ اپنی کامیابی پر آپے سے باہر ہوتے ہیں اور نہ بصورت دیگر غم اور مایوسی سے نڈھال ہوتے ہیں۔ دنیاوی سود و زیاں سے بے نیاز ہونے کے ساتھ وہ غیرت کے جذبے کا دامن

بھی مضبوطی سے تھامے رکھتے ہیں۔ غیر کے آگے سر جھکا کر عزت نفس کا سودا کسی قیمت پر بھی نہیں کرتے۔ اس طرح اسلام دنیا میں رہ کر دنیا سے بلند ہونے کا نام ہے۔

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحر بیکراں ہے زندگی

غلامی کی صورت میں انسان کی فکر اور اس کا عمل محدود ہو کر رہ جاتا ہے، لیکن آزادی کی دولت میسر آجانے کے بعد وہ بے جا پابندیوں کے بندھن سے نکل کر اپنے طور پر سوچ بھی سکتا ہے اور اپنے عمل کے لیے مناسب راستہ بھی اختیار کر سکتا ہے۔ اس طرح غلامی میں انسان کی زندگی اتھلے پانی کی چھوٹی سی نہر کی طرح ہوتی ہے جب کہ آزادی کی صورت میں اس کی زندگی ایک ایسا سمندر بن جاتی ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں ہوتا۔ گویا وہ اپنے فکر و عمل میں پوری طرح آزاد ہوتا ہے۔

غلامی کیا ہے ذوق حسن و زیبائی سے محرومی
جسے زیبا کہیں آزاد بندے ہے وہی زیبا
بھروسہ کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پر
کہ دنیا میں فقط مردان حر کی آنکھ ہے بینا

علامہ اقبال بتاتے ہیں کہ خوب و ناخوب کی صحیح تمیز صرف آزادی کی صورت ہی میں ہو سکتی ہے اور خوب و ناخوب کے بارے میں فیصلہ صرف آزاد افراد ہی کر سکتے ہیں، کیوں کہ دنیا میں صرف مردان حر کی آنکھ بینا کہلانے کی مستحق ہوتی ہے۔ اس کے برعکس وہ لوگ جو غلام ہوتے ہیں وہ اپنے آقاؤں کے ذہن سے سوچتے اور ان کی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ نتیجتاً نہ ان کے اذہان پر بھروسا کیا جاسکتا ہے اور نہ ان کی آنکھوں کو بینا کہنا درست ہے۔

آزادی افکار سے ہے ان کی تباہی
رکھتے نہیں جو فکر و تدبر کا سلیقہ
ہو فکر اگر خام تو آزادی افکار
انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ

مغرب میں لامحدود آزادی کا نعرہ جس طرح انسانوں کو حیوان بنا رہا ہے وہ کسی کی

نظروں سے پوشیدہ نہیں۔ لامحدود آزادی کے نعرے کی طرف جھکاؤ سب سے پہلے "روسو" کے خیالات نے پیدا کیا۔ وہ کہتا تھا کہ انسان آزاد پیدا ہوا ہے، لیکن وہ ہر جگہ زنجیروں میں جکڑا ہوا نظر آتا ہے۔ زنجیروں سے اس کی مراد معاشرتی اقدار تھیں۔ وہ انسان کو ان زنجیروں سے آزاد کرانے پر زور دیتا تھا، لیکن اس کے ان خیالات نے یورپ میں جو فساد پیدا کیا اس سے خود یورپ والے بھی پریشان نظر آرہے ہیں۔ علامہ اقبال لامحدود اور بے مہار آزادی کے تصورات کو تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے کہتے ہیں کہ آزادی کا کوئی تصور بغیر پابندی کے ممکن نہیں ہے۔ انھوں نے ایسے تمام نظریات کو خام بتایا ہے جو لامحدود آزادی کی طرف جھکاؤ پیدا کرتے ہیں اور آخر کار انسانوں کو حیوان بناتے ہیں۔

اقبال کا فلسفۂ خودی اور عہدِ حاضر

علامہ اقبال کا فلسفہ خودی دراصل انسان کی 'آزاد' منفرد' فعال اور تخلیقی صلاحیتوں سے آراستہ شخصیت کی مثبت و صحت مند تعبیر و تفسیر کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ یہ پورا فلسفہ انسان کی عظمت اور اس کی اعلا صلاحیتوں کی مدلل و محکم وضاحت کی ایک مثال ہے۔ ان کے فلسفۂ خودی کے تین اہم پہلو ہیں اور یہ تینوں پہلو تعلیمات قرآنی سے ماخوذ ہیں۔ ان کے نزدیک انسان اللہ تعالیٰ کا برگزیدہ بندہ ہے۔ اپنے اس خیال کے حق میں وہ قرآن پاک کی جس آیت کا حوالہ دیتے ہیں وہ یہ ہے :

ثم اجتباہ ربہ فتاب علیہ وھدیٰ (طٰہٰ۔ ۱۲۲)

(پھر اس (حضرت آدمؑ) کے رب نے اسے برگزیدہ کیا اور اس کی توبہ قبول کرلی اور اسے ہدایت بخشی۔)

انسان کی عظمت و رفعت کے سلسلے میں وہ دوسری بات یہ بتاتے ہیں کہ انسان اپنی تمام کمزوریوں کے باوجود زمین پر اللہ کا نمائندہ یا خلیفہ ہے۔ اپنے اس خیال کی تائید میں وہ قرآن پاک کی جن آیات کو پیش کرتے ہیں وہ یہ ہیں :

واذ قال ربک للملائکۃ انی جاعل فی الارض خلیفۃ قالوا اتجعل فیھا من یفسد فیھا ویسفک الدماءۚ ونحن نسبح بحمدک ونقدس لکۖ قال انی اعلم مالا تعلمون (البقرۃ ۔ ۳۰)

(پھر ذرا اس وقت کا تصور کرو جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا تھا کہ "میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔" انھوں نے عرض کیا "کیا آپ زمین میں کسی ایسے کو مقرر کرنے والے ہیں جو اس کے انتظام کو بگاڑ دے گا اور خوں ریزیاں کرے گا؟ آپ کی حمد و ثنا کے

ساتھ تسبیح اور آپ کی تقدیس تو ہم کر ہی رہے ہیں۔" فرمایا : "میں جانتا ہوں جو کچھ تم نہیں جانتے۔")

وھو الذی جعلکم خلائف الارض ورفع بعضکم فوق بعض درجات لیبلوکم فی ما آتاکم (الانعام۔ ۱۶۵)

(وہی ہے جس نے تم کو زمین کا خلیفہ بنایا' اور تم میں سے بعض کو بعض کے مقابلے میں زیادہ بلند درجے دیے تاکہ جو کچھ تم کو دیا ہے اس میں تمھاری آزمائش کرے)

اور سب سے آخری' مگر نہایت اہم پہلو یہ ہے کہ انسان اپنی شخصیت کا امین ہے اور اس نے یہ امانت خود کو خطرات میں ڈال کر قبول کی ہے۔ اس سلسلے میں قرآن پاک کا یہ ارشاد ہے :

انا عرضنا الامانۃ علی السماوات والارض والجبال فابین ان یحملنھا واشفقن منھا وحملھا الانسانؕ انہ کان ظلوما جھولا

(الاحزاب۔ ۷۲)

(ہم نے اس امانت کو آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا تو وہ اسے اٹھانے کے لیے تیار نہ ہوئے اور اس سے ڈر گئے' مگر انسان نے اسے اٹھا لیا' بے شک وہ بڑا ظالم اور جاہل ہے)

اس آیت مبارکہ کے مفہوم کو میر تقی میر نے نہایت خوب صورتی سے شعر میں ڈھالا ہے۔ وہ کہتا ہے :

سب پہ جس بار نے گرانی کی
اس کو یہ ناتواں اٹھا لایا

علامہ اقبال نے اپنے تصور خودی میں خداداد صلاحیتوں کی مالک اور اللہ تعالیٰ کی ہدایات سے آراستہ ایسی شخصیت کو پیش کیا ہے جو معاشرے میں رہتے ہوئے اپنی صلاحیتوں کو بروے کار لاسکے اور اللہ تعالیٰ کی ہدایات پر عمل پیرا ہو کر زندگی کو خوب صورت سے خوب صورت تر بنا سکے' جب کہ عہد حاضر میں پائے جانے والے تصورات انسان کو نہایت مجہول اور بے بس ظاہر کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں وجودی مفکرین

(Existentialists) کے خیالات بطور ثبوت پیش کیے جا سکتے ہیں۔ وجودیوں کے ابتدائی مفکر کر کے گار (Kirke garre) کا کہنا ہے کہ انسان خوف، دہشت اور اندیشوں میں گھرا ہوا ہے اور اس کا سب سے بڑا مسئلہ اس کے اپنے وجود کا بوجھ اور اسراریت ہے۔ اس کے نزدیک انسان صرف فرد واحد ہے۔ نہ فرد سے کم اور نہ فرد سے زیادہ۔ اس کائنات میں وہ تنہا ہے۔ وہ اپنے ہونے کا کرب تنہا برداشت کرتا ہے۔ عقیدہ بھی اس کے لیے اندھیرے میں ایک چھلانگ کے مترادف ہے۔ وجودیت کے اسی رویے کا دوستووسکی، کافکا، نطشے، جیس پرس، ہیڈیگر اور سارتر وغیرہ کے ہاں اپنے اپنے طور پر اظہار ہوا ہے۔ یوں تو اس رویے کے آثار ۱۸۸۰ء سے برابر ظاہر ہوتے رہے ہیں، لیکن جنگ عظیم دوم کے بعد سے بہت بڑی حد تک یہ مغرب کے ادیب اور دانش وروں کے اسلوب حیات کی صورت اختیار کر گیا ہے۔

وجودی مفکرین کے اس رویے نے معاشرے میں فردیت پرستی (Individualism)، احساس تنہائی اور مسلمہ معاشرتی و تہذیبی قدروں سے انحراف کو عام کیا ہے اور انسانیت کی پوری روایت کو مسترد کرنے پر زور دیا ہے جس کے نتیجے میں معاشرے میں نراجیت، لاقانونیت اور تخریب کاری کا رجحان زیادہ سے زیادہ عام ہوگیا ہے۔ اس سے پوری انسانیت کو خطرہ لاحق ہے۔ اس سلسلے میں نہایت تکلیف دہ بات یہ ہے کہ مغرب کے ادیب اور دانش ور حضرات کے زیر اثر اب مشرقی ممالک میں بھی وجودیت کے رویے کو خاصی بڑی حد تک اپنایا جارہا ہے۔ لہٰذا ان ممالک میں بھی نراجیت، لاقانونیت اور تخریب کاری کا رجحان مسلسل بڑھ رہا ہے۔ ایسی صورت میں انسانیت کو تباہی سے بچانے کے لیے علامہ اقبال کے مثبت اور صحت مند فلسفۂ خودی کی ترویج و اشاعت وقت کا ایک اہم تقاضا ہے۔

ہم نے علامہ اقبال کے فلسفۂ خودی کے تین پہلوؤں کا ذکر کیا ہے جس سے انسان کی آزاد، منفرد، فعال اور تخلیق ساز شخصیت ابھر کر سامنے آتی ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ خودی تجربات کا مرکز اور تہذیبی و معاشرتی اقدار کی اساس ہے جس کا واضح سبب یہ ہے کہ زندگی کی تمام قدروں کی تعمیر و تشکیل نفس انسانی ہی کی مرہون منت ہے۔ تہذیبی و معاشرتی اقدار کی تعمیر و تشکیل کے سلسلے کی کوئی حد نہیں ہے، لہٰذا خودی کو بقائے دوام

حاصل ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ سخت افسوس کی بات ہے کہ مسلمان متکلمین نے یونانی فلسفے اور دوسری غیر مسلم ثقافتوں کے زیر اثر رہ کر انسانی خودی پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی۔ وہ روح کو ایک نہایت لطیف و نفیس مادے سے تعبیر کرتے رہے جو جسم کے فنا ہونے کے ساتھ فنا ہو جاتی ہے اور روز حشر دوبارہ زندہ کی جائے گی۔ یہ تصور یکسر غیر اسلامی ہے۔ اقبال بتاتے ہیں کہ قرآن پاک واضح طور پر روحانی یا داخلی تجربے کو علم کا وسیلہ قرار دیتا ہے اور دوسرے دو وسیلوں یعنی فطرت اور تاریخ کو بھی داخلی تجربے سے جوڑ کر تجربے کی وحدت اور انسانی خودی کی مرکزیت کو اجاگر کرتا ہے۔ اپنے اس خیال کی تائید میں وہ منصور حلاج کے تجربے کی مثال دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حلاج کا داخلی تجربہ اپنی نوعیت کی اعلا ترین مثال ہے۔ جب وہ انا الحق کا دعوا کرتا ہے تو اس کا مطلب اللہ کی ماورائیت سے انکار ہر گز نہیں ہوتا۔ اس کے دعوے کو سمندر میں قطرہ ڈال کر قطرے کے وجود کو فنا کرنے سے تعبیر کرنا اس کے ساتھ سخت زیادتی ہے۔ اس کا دعوا دراصل تخلیقی انا کے اقرار کے ساتھ اس کی بقاے دوام کا اعلان ہے، یعنی وہ انسانی روح یا خودی کو مادے کی طرح فانی تصور نہیں کرتا۔ اس کے زمانے کے مسلم مفکرین نے غیر اسلامی تصورات کے تحت حلاج کے دعوے کو غلط سمجھا۔ اس سلسلے میں علامہ اقبال نے فرانسیسی مستشرق میسگنون (Massignon) کا حوالہ دیا ہے جو حلاج کے دعوے کی تشریح کرتے ہوئے بتاتا ہے کہ اس شہید صوفی نے اللہ تعالیٰ کی ماورائیت سے انکار قطعی نہیں کیا ہے، بلکہ اس کے تجربے کا نچوڑ انسانی خودی کی بقاے دوام کا جرات مندانہ اظہار ہے۔ اس زمانے کے مفکرین کے لیے جو انسانی خودی اور اس کی روح کو اس کے جسم کی طرح فانی سمجھتے تھے، حلاج کا یہ دعوا ایک چیلنج کی حیثیت رکھتا تھا، لہٰذا انھوں نے اسے یکسر مسترد کر کے حلاج کو واجب القتل قرار دیا۔ اقبال فرانسیسی مستشرق میسگنون (Massignon) سے اتفاق کرتے ہیں، کیوں کہ وہ خود بھی انسانی خودی کی بقاے دوام کے قائل ہیں۔

اقبال کہتے ہیں کہ آج کے مسلمان کے لیے خودی کی ماہیت کا عرفان ایک زبردست مسئلے کی صورت اختیار کر گیا ہے، کیوں کہ اس سلسلے میں ہمارے متکلمین کے ہاں غیر اسلامی تصورات بنام اسلام اس طرح داخل ہو گئے ہیں کہ ان کے اصل غیر اسلامی

سرچشموں تک نظر کا پہنچنا سخت دشوار ہو گیا ہے۔ چناں چہ وہ کہتے ہیں :

The task before modern muslims is, therefore, immense. He has to rethink the whole system of Islam without completly breaking with the past. Perhaps the first who felt the urge of a new spirit in him was Shah Waliullah of Delhi.

وہ کہتے ہیں کہ موجودہ مشکل صورت میں ہمارے سامنے صرف ایک ہی راستہ رہ جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے جدید علوم کو سامنے رکھیں اور اپنے ذاتی اور غیر تقلیدی رویے کو بروے کار لائیں، خواہ اس عمل میں ہمیں اپنے پیشرووں سے اختلاف ہی کرنا پڑے۔ وہ کہتے ہیں کہ فکر جدید کے نمائندے "مین بریڈلے" کا کہنا ہے کہ خودی یعنی انسانی انا کے حقیقت اصلی ہونے سے انکار ممکن نہیں۔ ظاہر ہے کہ حقیقت اصلی کا کوئی بھی تصور بقاے دوام سے عاری نہیں ہو سکتا۔ اقبال کہتے ہیں کہ خودی دراصل اپنے آپ کو ذہنی کیفیات کی اکائی میں ظاہر کرتی ہے اور ذہنی کیفیات اپنا وجود ایک دوسرے سے الگ برقرار نہیں رکھ سکتیں جیسا کہ مادی اشیا کے تمام اجزا الگ الگ اپنے طور پر بھی باقی رہ سکتے ہیں۔ لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ وحدت ذہنی اپنی ماہیت میں بالکل منفرد ہوتی ہے اور وحدت ذہنی کی اساس انسانی خودی ہے۔

امام غزالیؒ اور ان کے ہم نواؤں کے نزدیک خودی کی نمایاں خصوصیت ایک ناقابل تقسیم اور ناقابل تغیر و تبدل روحانی جوہر ہے جو تغیرات جہاں سے کسی طرح بھی متاثر نہیں ہوتا، لیکن اقبال کہتے ہیں کہ ناقابل تقسیم چیز کے لیے ضروری نہیں کہ وہ ہمیشہ باقی بھی رہے۔ خودی کا یہ ایک جامد تصور ہے جو علم نفسیات کی رو سے بھی قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ سب سے پہلے تو یہ بات ہی محل نظر ہے کہ خودی کی اپنی ذہنی کیفیات یا شعور و آگہی کے تجربات روحانی جوہر کی خصوصیات ہیں، مثلاً کسی مادی شے کا وزن اس مادی شے کی خصوصیت ہے نہ کہ اس کا جوہر روحانی۔ ایسی صورت میں خودی تک پہنچنے یا اس کا عرفان حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے ذہنی تجربات کی صحیح معنی میں تعبیر و توضیح کریں نہ کہ انھیں ایک روحانی خصوصیت سمجھ کر ذہنی کیفیات اور تجربات کی تعبیر و

توضیح سے کنارہ کش ہو جائیں۔

خودی کے ذہنی تجربات کی بات کی جاتی ہے تو کہا جاتا ہے کہ یہ تجربات زمان و مکاں کی حدود میں رہ کر ہی ممکن ہیں اور جب یہ صورت ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ خودی زمان و مکاں کے نظام میں کس طرح داخل ہوتی ہے؟ اس سوال کا جواب قرآن پاک میں نہایت وضاحت سے موجود ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے :

ولقد خلقنا الانسان من سلالۃ من طین ○ ثم جعلناہ نطفۃ فی قرار مکین ○ ثم خلقنا النطفۃ علقۃ فخلقنا العلقۃ مضغۃ فخلقنا المضغۃ عظاما فکسونا العظاما لحماً ثم انشاناہ خلقا آخر ط فتبارک اللہ احسن الخالقین (المومنون۔ ۱۲ تا ۱۴)

(ہم نے انسان کو مٹی کے ست سے بنایا' پھر اسے ایک محفوظ جگہ ٹپکی ہوئی بوند میں تبدیل کیا' پھر اس بوند کو لوتھڑے کی شکل دی' پھر لوتھڑے کو بوٹی بنا دیا۔ پھر بوٹی کی ہڈیاں بنائیں' پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا' پھر اسے ایک دوسری ہی مخلوق بنا کھڑا کیا۔ پس بڑا ہی بابرکت ہے اللہ' سب کاریگروں سے اچھا کاریگر)

ان آیات سے واضح ہے کہ انسان کا جسم ذہنی اناؤں پر مشتمل ہے اور ان ذیلی اناؤں پر ایک اعلا انا اثر انداز ہوتی ہے۔ اس اعلا انا کو ایک ایسا انسان بتایا گیا ہے کہ جس کی تقویم بالکل مختلف ہے۔ ظاہر ہے کہ ذیلی اناؤں کا تعلق زمان و مکاں کے نظام سے ہے جن پر اعلا انا اثر انداز ہوتی ہے۔ یہ نظام قدرت ہے اور اللہ تعالیٰ کا ایک ایسا انعام ہے جس پر جس قدر بھی شکر ادا کیا جائے کم ہے۔

علامہ اقبال کے تصور خودی کی جو تشریح ہم نے پیش کی ہے اس سے ظاہر ہے کہ حرکت و تغیر' سعی و عمل' زمان و مکان' عقل و شعور' حسن و عشق' غرض تمام ہی تصورات ان کے تصور خودی سے مربوط ہیں جسے وہ تجربے کا مرکز اور کائنات کی حقیقت اصلی سے تعبیر کرتے ہیں۔ چناں چہ کہتے ہیں :

پیکر ہستی ز آثار خودیست
ہرچہ می بینی ز اسرار خودیست

خودی صرف ماضی سے حاصل ہونے والے تصورات پر اکتفا نہیں کرتی' بلکہ اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر ان کو بدلتی اور ان میں مسلسل اضافہ بھی کرتی ہے۔ یہ جذبے کی شدت اور خیال کی بلندی کے ساتھ نت نئی تعبیرات سے گزرتی رہتی ہے۔ بلاشبہ یہ رویہ تقلید کی عین ضد اور اپنی نوعیت میں یکسر تخلیقی رویہ ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ زمانے میں صرف تغیر کو ثبات حاصل ہے۔ لہٰذا خودی مسلسل اور تواتر کے ساتھ نئے نئے مقاصد تخلیق کرتی رہتی ہے جو اسے عمل پیہم اور سعی و جستجو سے دو چار رکھتے ہیں اور بقائے دوام سے متصف کرتے ہیں۔ اقبال کہتے ہیں :

خودی وہ بحر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں
تو آبجو اسے سمجھا اگر تو چارہ نہیں

ہم نے عرض کیا تھا کہ خودی اپنے خیال و عمل میں آزاد ہے' لیکن خودی سے متعلق آزادی کے اس تصور پر اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ ہماری دنیا اسباب و علل کی دنیا ہے' لہٰذا یہ کس طرح ممکن ہے کہ خودی اسباب و علل سے آزاد ہو کر سرگرم عمل ہوسکے۔ اس ضمن میں اقبال نے جرمن فلسفی کانٹ کا حوالہ دیا ہے جو یہ کہتا ہے کہ جب ہم خالص احساس فرض کے تحت کوئی کام کرتے ہیں تو ہم ظاہری دنیا سے الگ حقیقی دنیا کا حصہ بن جاتے ہیں۔اقبال کانٹ کے اس خیال سے اتفاق کرتے ہوئے یہ اضافہ کرتے ہیں کہ خالص احساس فرض کے تحت اخلاقی کاموں کی صلاحیت کا ارتقا پذیر خودی کے ہاتھوں سنورنا بھی ضروری ہوتا ہے۔

علامہ اقبال خودی کی آگہی کے ساتھ اس کے استحکام اور ارتقا پذیری کے لیے یقین محکم، عمل پیہم اور محبت کے جذبے سے آراستہ ہونے کو بھی ضروری بتاتے ہیں۔ بہ الفاظ دیگر ہم ان اوصاف کو لازوال خودی کے لازمی اجزا کہہ سکتے ہیں۔ یہ اجزا باہم یکجا ہو کر ایک ایسی شخصیت کو وجود میں لاتے ہیں جو تلاش و جستجو اور فطرت کی تسخیر کے عمل سے کبھی تھکنے کا نام نہیں لیتی۔ تاہم وہ اپنے اس عمل تسخیر کو اپنے منصب خلافت الٰہی سے جوڑے رکھتی ہے جو اس کی تسخیر فطرت سے حاصل کردہ طاقت کو ہر طرح کی استحصالی سرگرمیوں سے باز رکھتی ہے۔ اس کی تسخیر فطرت کا عمل مغرب کے تسخیر فطرت کے عمل سے بالکل مختلف ہے۔ مغرب کے تسخیر فطرت کا عمل ہیروشیما اور

ناگاساکی کی بربادی جیسے سفاک اقدام پر منتج ہو سکتا ہے‘ جب کہ نیابت الٰہی سے آراستہ خودی کے ہاتھوں تسخیر فطرت سے حاصل کردہ طاقت دنیا کو تباہی کے غار میں دھکیلنے کے بجائے دنیا کو حسین سے حسین تر بنانے کا وسیلہ ہوتی ہے۔

اقبال کے تصور خودی کے مطابق انسان کو کائنات پر برتری حاصل ہے۔ یہ کائنات انسان کے لیے تخلیق کی گئی ہے نہ کہ انسان کو اس کائنات کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ کائنات پر برتری حاصل ہونے کی وجہ سے انسان کو کائنات پر حکمرانی کا حق حاصل ہے۔ لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس دنیا کی تمام اشیا انسان کی خودی کے آگے بالکل ہیچ ہیں‘ لیکن جب انسان اپنی خودی کو فراموش کر دیتا ہے تو کائنات کی اشیا اس کی حاکم بن جاتی ہیں اور وہ ان اشیاکے حصول کو اپنا مقصد بنا لیتا ہے۔ اس طرح وہ خود کو گنوا کر دولت و اقتدار کے پیچھے بھاگنے لگتا ہے جو اسے انسانی بلندیوں سے گرا کر حیوانی سطح پر لے آتا ہے۔

علامہ اقبال کا فلسفۂ خودی جیسا کہ ہم نے عرض کیا‘ عظمت انسان کی تشریح و تفسیر ہے۔ لہٰذا یہ بات بجا طور پر کہی جاسکتی ہے کہ عرفان خودی سے مراد انسان کا اپنی خداداد صلاحیتوں سے واقف ہونا ہے اور اس واقفیت کے بعد آزادانہ طور پر عمل پیہم اور مسلسل سعی و جستجو کو اپنا شعار بنا کر انسانی شعور میں اضافے کے ساتھ اس دنیا کو حسین سے حسین تر بنانا ہے‘ لہٰذا خودی کا لازوال ہونا یا بقائے دوام سے متصف ہونا ایک ناقابل انکار حقیقت ہے۔ بلاشبہ علامہ اقبال کا یہ مثبت و صحت مند تصور خودی عہد حاضر کے منفی و مریضانہ تصور انسان کی ضد ہی نہیں ہے‘ بلکہ اس منفی و مریضانہ تصور کے نتیجے میں جو نراجیت اور لاقانونیت کی فضا پیدا ہوگئی ہے‘ اس سے نمٹنے کے لیے بھی اقبال کے تصور خودی کی ترویج و اشاعت وقت کا ایک اہم تقاضا ہے۔

جگن ناتھ آزاد کی چند تصانیف

پروفیسر جگن ناتھ آزاد کا اردو ادب میں ممتاز مقام ہے۔ شاعری، تنقید اور تحقیق غرض کہ ہر شعبۂ ادب میں ان کی خدمات نمایاں ہیں۔ شاعری میں وہ ایک منفرد اسلوب کے حامل ہیں۔ یہ اسلوب سادگی و پُرکاری کا مرقع ہے، اسی طرح جس طرح عام زندگی میں ان کا رویہ تصنع اور بناوٹ سے پاک ہے۔ گویا ان کی شاعری ان کے مزاج اور شخصیت کی آئینہ دار ہے۔ تنقید میں بھی ان کا ذوق سلیم قدم قدم پر نظر آتا ہے۔ ایسی تنقید جو ذوق سلیم سے عاری ہو، خشک علمی مباحث کا بوجھ ہی ہو سکتی ہے۔ تنقیدی عمل کو اکثر تحقیق کی ضرورت پیش آتی ہے۔ جگن ناتھ آزاد کے تحقیقی کارنامے بھی دراصل تنقیدی ضرورتوں کو پورا کرنے کے پیش نظر ہی عمل میں آئے۔

علامہ اقبال کے فن اور فلسفے سے جگن ناتھ آزاد کو خصوصی لگاؤ ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اقبالیات کے موضوع پر ان کا تحقیقی و تنقیدی کام نہایت وقیع ہے۔ اقبال کی فکر پر مغربی مفکرین کے اثرات ہوں یا مغربی مفکرین کے اقبال کے بارے میں تاثرات، انھوں نے اقبال اور مغرب کے حوالے سے ان دونوں گوشوں کو بھرپور انداز سے روشن کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسی طرح اقبال اور تصوف کے موضوع پر ان کا مطالعہ نہایت دلچسپ اور حقائق پر استوار ہے۔ اس وقت میرے سامنے جگن ناتھ آزاد کی چند تصانیف ہیں جن پر اپنے تاثرات الگ الگ پیش کرتا ہوں۔

اقبال اور اس کا عہد

"اقبال اور اس کا عہد" پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی نہایت وقیع تصنیف ہے جس میں

انھوں نے ڈاکٹر علامہ اقبال کے نظریۂ تصوف اور حافظ شیرازی کی شاعری کے بارے میں ان کے خیالات کی وضاحت کی ہے۔ علامہ اقبال نے جب اپنی مشہور مثنوی "اسرار خودی" لکھی تو پورے ملک میں بعض اہل قلم نے ایک طوفان برپا کر دیا تھا۔ پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے نہایت مدلل انداز سے ثابت کیا ہے کہ علامہ اقبال اسلامی تصوف کے قائل تھے، لیکن یونانیوں اور دوسری اقوام کے زیر اثر رواج پانے والے ایسے تصوف کے خلاف تھے جو قوم کو عمل سے دور کرتا ہے۔

حافظ کی شاعری کے سلسلے میں بھی یہ ایک حقیقت ہے کہ علامہ اقبال ان کی شاعری کے دل دادہ تھے، لیکن حافظ کی شاعری سے جو غنودگی کا عالم اور بے عملی کی کیفیت پیدا ہوتی ہے، علامہ اقبال اس کے خلاف تھے۔ جگن ناتھ آزاد سے پہلے ان مسائل پر ڈاکٹر یوسف حسین خاں اور علامہ میکش اکبر آبادی نے بھی بہت بھرپور انداز سے علامہ اقبال کی حمایت کی ہے، لیکن آزاد کا اپنا انداز ہے جس کی وجہ سے اس کتاب کی اپنی اہمیت ہے۔

نوائے پریشاں

جگن ناتھ آزاد ایک سچے اور اچھے شاعر ہیں۔ ان کا مجموعۂ کلام "نوائے پریشاں" اس وقت میرے سامنے ہے۔ ان کے کلام میں تازگی اور ندرت کی کمی نہیں، لیکن انھوں نے جدیدیت سے اپنے دامن کو کبھی بھی آلودہ نہیں ہونے دیا ہے۔ شاعری کا وہ دبستان جسے جدیدیت کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، دراصل صحت مند فکر اور معقولیت سے انکار پر قائم خیال کیا جاتا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس دبستان شاعری سے وابستہ بعض شعرا کے ہاں اعصابی تشنج کی سی کیفیت کا احساس ہوتا ہے اور منفی سوچ کا عکس جھلکتا ہے۔ اس کے برعکس جگن ناتھ آزاد اعلا اخلاقی اقدار اور انسانی شرافت سے اپنا رشتہ استوار رکھتے ہیں اور ان اقدار و اوصاف کو اپنے احساس میں ڈھال کر نہایت لطیف، نازک، منفرد اور تازہ تر انداز میں ان کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ اظہار ہی ان کی شاعری کا امتیاز ہے جس میں نہ کہیں شعری روایت کا انکار ہے اور نہ شعری روایت سے

تقلیدی انداز میں چمٹے رہنے کی کوشش ہے۔ وہ بنیادی طور پر تخلیقی آدمی ہیں اور اپنی اس خصوصیت کے ساتھ روایت کو مسلسل آگے بڑھا رہے ہیں۔ ان کے کلام میں تازگی و تاثیر گلے ملتے نظر آتی ہیں۔ ان کے اشعار پڑھتے وقت محسوس ہوتا ہے کہ کوئی ہمارے اپنے دل کی باتیں ہمیں سنا رہاہے۔ ان کی شاعری جہان آگہی و خود آگہی کا نہایت موثر وسیلہ ہے۔

ہندوستان میں اقبالیات

پروفیسر جگن ناتھ آزاد اقبالیات کے مشہور ماہر ہیں۔ انھوں نے علامہ اقبال کا مطالعہ ہر رخ اور ہر سمت سے کیاہے۔ انھوں نے علامہ اقبال کے خیالات و نظریات کو مغربی مفکرین کے خیالات و نظریات کے تناظر میں بھی دیکھا ہے اور مشرقی فلسفے کے پس منظر میں بھی ان کو پرکھا ہے۔ انھوں نے علامہ کی نثر کا بھی مطالعہ کیاہے اور ان کی شاعری پر بھی گہری نظر ڈالی ہے۔ غرض علامہ اقبال، ان کے نظریات، ان کی شاعری اور شخصیت پر جگن ناتھ آزاد کے خیالات بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔

"ہندوستان میں اقبالیات آزادی کے بعد اور دوسرے توسیعی لیکچر" جگن ناتھ آزاد کے چار توسیعی لیکچروں پر مشتمل ہے۔ ان لیکچروں کے عنوانات ہیں : ہندوستان میں اقبالیات آزادی کے بعد، اقبال مغربی مصنفین کی نظر میں، انسان اقبال کی نظر میں اور اقبال اور جوش۔

یہ چاروں لیکچر نہایت ذمے داری سے لکھے گئے ہیں۔ اقبال پر جو اعتراضات کیے گئے ہیں ان میں ان کو بھی گہرائی میں جاکر پرکھا گیا ہے اور اقبال پرستی کے جوش میں جو غیر ذمے دارانہ باتیں کہی گئی ہیں ان کا تجزیہ بھی کیا گیا ہے۔ اقبال اور جوش کے عنوان سے جو لیکچر اس کتاب میں شامل کیا گیا ہے اس میں آزاد نے ان خیالات کو پیش کیا ہے جو انھوں نے خود جوش صاحب کی زبان سے سنے ہیں۔ اس طرح اس لیکچر کی ایک تاریخی اہمیت بھی ہے۔

یہ چاروں لیکچر اقبالیات کے سلسلے کی نہایت اہم کڑی کی حیثیت رکھتے ہیں اور اقبال

اور ان کے بارے میں لوگوں کے رویوں پر نہایت مفید معلومات فراہم کرتے ہیں۔

اجنتا

"اجنتا" کے غاروں میں جو سنگ تراشی کا مظاہرہ کیا گیا ہے وہ لازوال، لافانی اور لاثانی فن کا نمونہ ہے جسے دنیا کے عجائبات میں شمار کیا جاتا ہے۔ جگن ناتھ آزاد ایک قادر الکلام شاعر ہیں۔ جب وہ اجنتا کے غاروں کی سیر کو گئے تو فن سنگ تراشی کے نمونوں کو دیکھ کر حیران رہ گئے اور انھوں نے فن کے ان شاہ کاروں سے سوال کرنا شروع کر دیے کہ یہ کس فن کار کے خیال کا جیتا جاگتا مظہر ہیں اور وہ رنگ و حسن جو اجنتا کے غاروں میں نظر آتا ہے، وہ آج دنیا میں کیوں مفقود ہو گیا ہے؟

یہ نظم علامہ اقبال کی مسجد قرطبہ کی یاد دلاتی ہے۔ جس طرح علامہ مسجد قرطبہ کے جلال و جمال کو دیکھ کر ماضی میں سفر کرتے ہیں اور اندلس میں مسلمانوں کی شان و شوکت کو دیکھتے ہیں، اسی طرح جگن ناتھ آزاد اجنتا کے حسن کو دیکھ کر عہد قدیم کے ہندستان کی فنی بلندیوں سے سرشار ہوتے ہیں اور اپنے عہد کی نارسائیوں کی تلخیوں کو ابھارتے ہیں۔ اس نظم کا انگریزی ترجمہ بھی ہوا جو ڈاکٹر بی رستوگی نے کیا ہے اور نہایت خوب صورت اور اثر انگیز کیا ہے۔

جگن ناتھ آزاد اور اس کی شاعری

آخر میں پروفیسر آزاد پر ایک کتاب کا مختصر تذکرہ بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔

"جگن ناتھ آزاد اور اس کی شاعری" ملک کے نامور نقادوں کے مضامین کا مجموعہ ہے جو پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی شاعری کے بارے میں لکھے گئے ہیں۔ ان نامور نقادوں میں فراق گورکھ پوری، نریش کمار شاد، خواجہ احمد عباس، مخمور جالندھری، حامد علی خاں، سر عبدالقادر، وقار عظیم، آل احمد سرور، مانی جائسی اور عبد المجید سالک خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان مضامین کو محترمہ حمیدہ سلطان احمد نے مرتب کیا ہے۔ جس شاعر کے

بارے میں ایسے نامور نقادوں نے اپنی رائے کا اظہار کیا ہو اس کی اہمیت و حیثیت کے بارے میں کسی طرح کے شک کی گنجائش باقی ہی نہیں رہتی۔ فراق صاحب کا خیال ہے کہ جگن ناتھ آزاد نے دور حاضر کی اردو شاعری میں اپنے لیے ایک خاص جگہ پیدا کرلی ہے۔ اس کا ہر صاحب ذوق کو بخوبی اور بے تکلف اعتراف ہوگا۔ وہ آگے چل کر مزید لکھتے ہیں کہ آزاد کی شاعری میں جو صفت سب سے زیادہ جاذب نظر اور سب سے زیادہ دل کش ہے وہ آزاد کی نیکی اور انسانیت ہے جس میں تصنع کا نام نہیں۔ آزاد کے خیالات اور ان کے لہجے میں سچی انسانیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ "ایں سعادت بزور بازو نیست"۔

جو جگن ناتھ آزاد سے ملا ہے اور جس نے ان کی شاعری بھی پڑھی ہے وہ فراق صاحب کی رائے سے اختلاف نہیں کر سکتا۔ ان کی شاعری ہمارے عہد میں خوش کلامی کی ایک اعلا مثال ہے۔

ہمکلام

آپ میں سے بہت سے خواتین و حضرات نے دنیا کے مشہور عجائب گھروں کی وہ پُرشکوہ گیلریاں دیکھی ہوں گی جن میں بڑی بڑی صاحب عظمت تاریخی شخصیات کی روغنی تصاویر آویزاں کی گئی ہیں اور جہاں پہنچ کر دیکھنے والے کو ایک خاص مرعوبیت اور خود کی کم مائیگی کا ایک دبا دبا سا احساس ہوتا ہے۔ ایسی ہی صورت حال سے اس وقت میں بھی دو چار ہوں۔ اس شہر پریشاں کے قد آور، عظیم اور قابل احترام اساتذہ' ادبا و شعرا اور بزرگ نقادوں کے درمیان ایک بڑی ذمے داری پر فائز کر کے مجھے "دامن ترمکن ہشیار باش" کی سی کیفیت میں مبتلا کر دیا گیا ہے۔ بہ ایں ہمہ مجھے یہ فخر اور حوصلہ نصیب ہے کہ ہماری تہذیب و اخلاق کے حوالے سے اس شہر بے مثال کے نہایت معتبر و محترم انسان دوست ادیبوں اور شاعروں میں میری بات سنی جا رہی ہے۔

شعر و ادب کے حوالے کے بغیر میرا اور صبا اکبر آبادی صاحب کا تعلق وہی ہے جو دہلی اور اکبر آباد کے درمیان رہا ہے اور اب بھی ہے۔ مغل دور حکومت کی ابتدا کہیں ہوئی ہو' اس کو عروج اکبر آباد سے ہی نصیب ہوا۔ اس کے ابتدائی تاریخی نقوش اکبر آباد میں موجود و محفوظ ہیں۔ پھر یہاں لازوال محبت کا بین الاقوامی نشان احترام "تاج محل" کی صورت میں موجود ہے جو یہاں کے رہنے والوں کو محبت ہی محبت کا پیغام دیتا ہے۔ اکبر آباد کی ہر بڑی شخصیت اور شاعر' خواہ وہ میر ہوں یا غالب' انھوں نے اکبر آبادی ہونے کے باوصف اپنی نسبت کو دہلی قرار دیا۔ ایسا بھی ہے کہ جو دہلی میں پیدا ہوا اور اکبر آبادی کہلایا' جیسے نظیر اکبر آبادی۔ ان کا مولد تو دہلی ہے اور اکبر آبادی مشہور ہیں۔ یوں دہلی اور اکبر آباد کا جو تعلق خاطر تھا' وہ اس عہد میں میرے اور صبا صاحب کے درمیان پیدا ہوا۔ تفصیل اس اجمال کی کچھ یوں ہے کہ میں اور صبا صاحب آج کل

ہم شہر بھی ہیں اور اس کتاب کے حوالے سے ہم کلام بھی اور ایک لحاظ سے ہم خیال بھی! جہاں میرا ادارۂ خدمت الناس ہے، اسی علاقے میں صبا صاحب کا قیام ہے۔ اپنے علم کدے میں صبا صاحب جس فکر و عمل میں مصروف ہیں وہ تہذیب و اخلاق، انسان دوستی اور جہان دوستی کے حوالے سے میرا بھی مشن ہے۔

ہماری زندگیاں محبت انسان کی ترویج اور تہذیب و اخلاق کی اشاعت میں گزری ہیں۔ صبا صاحب کا کلام جب بھی دیکھنے کو ملا، مجھ پر کھُلا کہ وہ اپنی شاعری کو عمل خیر کے طور پر متواتر جاری رکھے ہوئے ہیں جو اس عہد خرابی میں مثال رخشندہ و تابندہ ہے۔

بارے اب ذکر کچھ "ہمکلام" کا ہو جائے۔ ایک تو گفتۂ غالب کہ اس کو سمجھنے کے لیے ذہن رسا کے ساتھ علمی فہم، ذوق سلیم اور تلمیحات شاعرانہ پر مکمل عبور کے بغیر کام نہیں چل سکتا۔ پھر غالب کا فارسی کلام جس پر انھیں بجا طور پر فخر و ناز تھا۔ اس کے بعد فن شاعری کی سب سے مشکل صنف سخن رباعی۔ اس طرح "ہمکلام" میں حضرت صبا اکبر آبادی نے غالب کی فارسی رباعیات کا اردو رباعیات میں ترجمہ کر کے گویا ایک ہفت خواں سر کیا ہے۔ استاد محترم جناب مجنوں گورکھ پوری نے تحریر فرمایا ہے :

> "جب میں نے صبا صاحب کے یہ ترجمے دیکھے تو مجھ پر کھُلا کہ یہ
> ترجمے اتنے اعلا درجے کے ہیں کہ ان سے بہتر ترجمہ نہیں ہو سکتا۔
> فارسی کو ہٹا دیں تو یہ ایک اعلا سطح کی تخلیق ہے۔"

صبا اکبر آبادی صاحب خود ایک بلند پایہ شاعر ہیں۔ اردو، فارسی زبان کی گیرائی، لفظ کے معنی اور اس کے استعمال میں ذرا سے رد و بدل سے اس کی ہمہ گیری میں فرق آجانے سے مکمل طور پر واقف ہیں۔ ان کو الفاظ کے استعمال پر استادانہ عبور حاصل ہے۔ اس سے رباعیات غالب محض لفظی ترجمہ بن کر نہیں رہ گئیں، بلکہ جناب صبا اکبر آبادی صاحب نے غالب کے کلام کی روح میں اتر کر ایک مرحلۂ تخلیق انجام دیا ہے۔

فارسی زبان سے ان دنوں جو مغائرت پائی جاتی ہے، اس کے بارے میں خود جناب صبا اکبر آبادی صاحب نے "ہمکلام" کے دیباچے میں فرمایا ہے :

> "فارسی کے اساتذہ بھی درس گاہوں میں اب تو لغت کی مدد سے
> فارسی زبان پڑھاتے ہیں۔ خود فارسی کا مولد و گہوارہ ایران بھی اب تو

اپنی قدیم ادبیات کو ترک کر رہا ہے جس کے باعث موجودہ فارسی اب پچاس برس پہلے کی فارسی سے مختلف البطن معلوم ہوتی ہے۔"

اس صورت میں غالب کی فارسی زبان کے معنی کو ان کی عظمت روح کے ساتھ اردو میں منتقل کرنا یقیناً ایک بڑا کام ہے جس کو جناب صبا اکبر آبادی جیسا زبان داں اور قادر الکلام شاعر ہی انجام دے سکتا تھا۔

میں شاعرانہ باریکیوں سے واقف ہونے کا مدعی نہیں۔ بہ ایں ہمہ اچھا شعر مجھے متاثر ضرور کرتا ہے۔ غالب کا کوئی شعر میں نے ایسا نہیں پایا جو انسانی جذبات کے بند دریچوں پر دستک نہ دیتا ہو۔ اس لیے غالب اپنے دور ہی کے ترجمان شاعر نہیں تھے' وہ تو اپنے بعد آنے والے دنوں' برسوں اور زمانوں کے شاعر تھے۔ جہاں وہ اپنے شعر میں اپنی شخصیت کو دشت امکاں کی وسعتوں میں غرق کر دیتے ہیں وہاں ان کی عظمت اور جلالت کا بھرپور اندازہ ہوتا ہے اور زمان و مکاں کی قیود سے آزاد نبض کائنات پر ان کے احساس کی انگلیوں کے لمس سے پڑھنے والا آج بھی حظ اٹھاتا ہے۔ ایسا ہی حظ غالب کی فارسی رباعیات کے اس ترجمے کے مطالعے میں محسوس ہوتا ہے' کیوں کہ جناب صبا اکبر آبادی صاحب خود بردوش فکر غالب وسعت کون و مکاں کے اطراف و عمق میں اردو الفاظ کی قوس و قزح کو پھیلاتے چلے جاتے ہیں اور پڑھنے والا لطف و سرخوشی میں ڈوب کر ان کے ساتھ ساتھ رہتا ہے۔ کہیں وہ خود کائنات میں گم اور کہیں کائنات ان میں گم۔

جناب صبا اکبر آبادی بحیثیت شاعر اور بحیثیت انسان نہایت مہذب اور متین شخصیت کے حامل ہیں۔ ان کی شاعری میں انسانیت کی قدر افروزی بھی ہے اور انسان کی خودی کا احترام بھی اور یہی عمل ان کی نجی زندگی میں بھی جھلکتا ہے۔ ان میں غالب کی شوخی اور طنازی بھی ہے اور بے غرضی بھی' مگر بے پناہ قناعت اور فروتنی کے بھی وہ مالک ہیں۔ اس طرح ان میں اور غالب میں کئی اقدار تو مشترک ہیں' لیکن غالب کی متاہلانہ زندگی کا شکوہ کہیں نہیں ملتا کہ جو غالب کی نثر اور شاعری میں اکثر ابھر آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جناب صبا اکبر آبادی کو لائق اور صالح اولاد سے بھی نوازا ہے اور وہ کہیں بھی بیگم کو بلائے جاں کہتے نظر نہیں آتے اور نہ بھاگ کر حج پر جاتے ہیں جیسا کہ

غالب کی ایک رباعی کا ترجمہ انھوں نے "ہمکلام" کے صفحہ ۳۵ پر درج کیا ہے۔

بہ ایں ہمہ انھوں نے غالب کے ساتھ ساتھ رہ کر اس شوخی اور طنازی اور بعض صورتوں میں اس گرم مزاجی کو بھی انگیز کرتے ہوئے غالب کا مزاج اور جذبہ خود پر طاری کر کے ایسی رباعیات کا خوب بھرپور ترجمہ نہایت موثر انداز میں کیا ہے جن پر اہل ایمان اپنی پسندیدگی کا اظہار کر سکتے ہیں۔

غرض کہ جو کاوش اور سعی بلیغ جناب صبا اکبر آبادی نے غالب کی فارسی رباعیات کو نفیس مزاجی کے ساتھ اردو میں ڈھالنے کا کام انجام دے کر کی ہے، وہ اردو ادب میں ایک گراں مایہ اضافہ ہے۔ پھر "ہمکلام" کو نہایت نفاست اور موثر انداز میں شائع کیا گیا ہے جو خود ایک قابل تعریف کام ہے۔

اللہ تعالیٰ وہ سب کچھ بھی کرنے کی توفیق جناب صبا اکبر آبادی صاحب کو عطا فرمائیں جس کا وہ ارادہ رکھتے ہیں اور جس کے زیر طباعت ہونے کی نوید "ہمکلام" کے ٹائٹل کے آخری صفحے پر ملتی ہے، خصوصاً غالب کے مکمل دیوان کی تضمین جس پر وہ ایک طویل عرصے سے کام کر رہے ہیں اور جس کی تکمیل کا مژدہ بھی انھوں نے سنایا ہے۔ ساتھ میں ان کی سوانح حیات جو "یادوں" کی صورت میں تحریر کی جارہی ہے، ایک اہم تاریخی، تہذیبی اور تمدنی دستاویز ہوگی، انشاء اللہ تعالیٰ۔

ڈاکٹر شان الحق حقّی

میں اس محفل خراج تحسین میں شریک ہو کر جتنا مسرور ہوں اتنا ہی متذبذب بھی کہ جناب شان الحق حقّی جیسی قد آور ادبی شخصیت سے منسوب اس محفل میں، میں کس جگہ بٹھا دیا گیا ہوں اور پھر ایسی محفل جس میں دانش وران گرامی کا ہجوم ہے۔ بہرحال تعمیل حکم میرا شیوہ ہے۔۔

نامور اہل علم و دانش نے جناب حقّی کے لیے بہت کچھ فرمایا ہے اور جو کچھ کہا ہے وہ حرف صحیح کی حیثیت رکھتا ہے، لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ حق حقّی ادا نہیں ہوا، کیوں کہ خدمات حقّی کے اعتراف کے لیے کئی محفلیں بھی ناکافی ہوں گی۔

شان الحق حقّی اردو ادب کی نہایت وقیع اور معتبر شخصیت ہیں۔ انھیں اردو، انگریزی اور فارسی زبانوں پر مکمل عبور ہے۔ عربی سے ان کی یاد اللہ ہے اور سنسکرت سے وہ اس قدر واقف ہیں کہ انھوں نے چانکیہ کے ارتھ شاستر کو اردو میں منتقل کیا ہے۔ اردو میں ارتھ شاستر کا یہ پہلا ترجمہ ہے۔ وہ بھگوت گیتا کا ترجمہ بھی مکمل کر چکے ہیں جو ابھی زیر طبع ہے۔ یوں تو وہ ایک شاعر کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں، لیکن ان کے افسانے، تنقیدی مضامین، تحقیقی کارنامے، لسانی مسائل پر ان کی بصیرت افروز تحریریں، علم لغت و قواعد پر ان کے مقالے، بچوں کے لیے نظمیں، پہیلیاں اور کہہ مکرنیاں، تاریخ گوئی، تراجم، اساتذہ کے کلام کا انتخاب اور ان پر مقدمے، غرض ادب کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جہاں وہ ممتاز و منفرد حیثیت سے موجود نہ ہوں۔ جس زمانے میں وہ حکومت پاکستان کے شعبۂ مطبوعات سے وابستہ تھے تو دفتری اوقات کے علاوہ ترقی اردو بورڈ کراچی میں سکریٹری کی حیثیت سے اعزازی خدمات بھی انجام دیتے تھے۔ اس حیثیت سے انھوں نے اردو کی عظیم لغت کی ترتیب میں جس جگر کاوی اور دل سوزی سے کام کیا وہ ہمیشہ یاد

رکھا جائے گا۔ ان کی ان ہمہ جہت خدمات کے اعتراف میں انھیں صدارتی ایوارڈ "ستارۂ امتیاز" سے بھی نوازا گیا ہے۔

یوں تو پاکستان میں دلّی سے ہجرت کر کے آنے والے لوگوں کی تعداد بہت زیادہ ہے، لیکن ان میں سے چند ہی ایسے شخص ہیں جن کی زبان کو درجۂ استناد حاصل ہے۔ ان گنی چنی شخصیتوں میں سے ایک شان الحق حقی ہیں جن کا تعلق دلی کے ایک قدیم علمی گھرانے سے ہے۔ ان کے والد گرامی مولوی احتشام الدین صاحب اپنے زمانے کے نہایت ممتاز ماہر زبان تسلیم کیے جاتے تھے۔ ان کے مورث اعلا حضرت عبد الحق محدث دہلوی کی مذہبی اور روحانی تعلیمات آج بھی ہمارے لیے سرچشمۂ رشد و ہدایت ہیں۔

حقی صاحب کے گھرانے کو ایک طرف علم سے گہرا لگاؤ رہا ہے تو دوسری طرف اس گھرانے کے افراد تہذیب و ثقافت کے فروغ کی جدوجہد میں بھی پیش پیش رہے ہیں۔ خود جناب شان الحق حقّی برصغیر کی مسلم تہذیب کا ایک جیتا جاگتا نمونہ ہیں۔ یہ تہذیب ان کے رگ و پے میں اس طرح پیوست ہے اور ان کے لہو میں اس طرح شامل ہے کہ جیسے ان کے اپنے وجود کا حصہ ہے۔ میرے اس بیان کی تصدیق ان کی شاعری اور ان کے دوسرے تخلیقی کارناموں سے بخوبی ہو سکتی ہے۔

جناب شان الحق حقّی بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں، لیکن ان کی غزل عہد حاضر کے بہت سے مغرب پرست شعرا کی طرح اپنی شعری روایت اور اپنے تہذیبی مزاج سے کٹی ہوئی نہیں ہے۔ وہ عصری تقاضوں کو پوری طرح محسوس کرتے ہیں اور اپنے تخلیقی عمل میں ان تقاضوں کے ساتھ پورا انصاف بھی کرتے ہیں جو اپنے عہد سے ان کی سچی اور گہری وابستگی کا بیّن ثبوت ہے۔ بہ ایں ہمہ وہ اپنی اس گہری وابستگی کے باوجود اپنے تہذیبی مزاج اور تاریخ کے تسلسل کو کسی قیمت پر بھی محو نہیں ہونے دیتے۔ وہ شعری روایت کو کوئی جامد حقیقت نہیں سمجھتے، بلکہ وہ روایت کو زندگی کی طرح متحرک ٹھیراتے ہیں۔ وہ روایت کے صحت مند اجزا کو برقرار رکھتے ہوئے اس میں عصری آگہی اور جدید طرز احساس کو اس طرح شامل کرتے ہیں کہ تہذیب کی اکائی مستحکم رہتی ہے۔ حقّی صاحب کی تصانیف کی فہرست خاصی طویل ہے، لیکن اس فہرست میں ان کے تین شعری مجموعے، افسانوں کا مجموعہ، تنقیدی مضامین کے دو مجموعے، شیکسپیئر کے مشہور عالم

ڈرامے ''انتھونی اینڈ کلیو پیڑا'' (ANTHONY AND CLEOPATRA) کا منظوم ترجمہ، چانکیہ کے ارتھ شاستر کا سنسکرت سے ترجمہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ان کے تخلیقی کارنامے تو خیر اپنی جگہ منفرد حیثیت رکھتے ہی ہیں، لیکن ان کے تراجم بھی اپنی نوعیت میں تخلیقی ہی معلوم ہوتے ہیں۔ انھوں نے شیکسپیئر کے مذکورہ ڈرامے کا منظوم ترجمہ جس حسن و خوبی اور روانی سے کیا ہے اسے دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ ان کا اپنا تخلیقی کارنامہ ہے۔ اصل متن میں بغیر کسی تحریف کے ترجمے کو تخلیق بنا دینا کوئی آسان بات نہیں ہے، لیکن حقّی صاحب کے خلّاق ذہن کے لیے یہ کچھ دشوار نہیں ہے۔ تخلیقی ذہن بہرحال تخلیقی ہی رہتا ہے۔ شیکسپیئر کے مذکورہ ڈرامے کے علاوہ حقّی صاحب کے دوسرے تراجم بھی اصل متن میں کسی طرح کی تبدیلی کے بغیر تخلیقی شان کے حامل ہیں۔

میں حقّی صاحب کے پیچھے پیچھے چل رہا ہوں۔ وہ ۱۹۱۷ء میں اس دنیا میں آئے تو میں ۱۹۲۰ء میں آیا اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ اب بھی میدان علم و ادب میں آگے ہیں، لیکن میری خواہش ہے کہ اب وہ حیات کی آخری منزل میں پیچھے رہ جائیں۔

(صدارتی کلمات بتقریب تہنیت و مذاکرہ پلاٹینم جوبلی ڈاکٹر شان الحق حقّی)

عصری شعور کی علامت

شیخ ایاز صرف منفرد شاعر ہی نہیں، بلکہ عصری شعور کی بھی ایک زندہ علامت ہیں۔ انھیں سندھی اور اردو زبانوں پر یکساں قدرت حاصل ہے۔ انھوں نے سندھی شاعری کی صنف "وائی" کو از سرنو زندہ ہی نہیں کیا، بلکہ سو سال سے فراموش کردہ اس صنف کو جدید حسیت سے آراستہ کر کے عہد حاضر کے لیے بامعنی اور کیف ساماں بھی بنایا ہے۔ اسی طرح انھوں نے بیت اور دوہے جیسی اصناف کو نئی سمتوں سے آشنا کر کے پیش کیا ہے۔ ان کی اعلا تخلیقی صلاحیتوں نے نہ صرف سندھی شاعری میں اپنے دیس اور اپنے عہد کی حسی اور فکری فضا کو ابھارا ہے، بلکہ اردو شاعری کو بھی ایک نئے ذائقے سے آشنا کیا ہے۔ یہ نیا ذائقہ ایسی تراکیب، استعاروں اور ایسی تلمیحوں سے عبارت ہے جن کا تعلق خالص اپنی زمین سے ہے۔ مثال کے طور پر اردو غزل میں سسّی، پنّوں اور بیجل گائک جیسے کرداروں کو مختلف اقدار حیات کے طور پر استعمال کر کے ہماری شاعری میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے۔ استعاروں اور تلمیحوں سے قطع نظر انھوں نے ایسی تراکیب بھی وضع کی ہیں جو فارسی، عربی سے الگ خالص اپنی زمین کے رنگ و آہنگ کی آئینہ دار ہیں۔ مثلاً "پیار پکھروا"، "ملن مدرا"، "ندیا کا تیکھا تار"، "ہرنی جیسے میرے منوا"، "جگنو کی جھل مل"، "تاروں کی ٹم ٹم"، "کھلے کنول سے پاؤں"، "محبوب کی باتیں جیسے تالاب پر ہنس آئے"، وغیرہ وغیرہ۔ آپ نے دیکھا کہ ان سب تراکیب کی مٹھاس اور مہک ہمارے اپنے ماحول سے ابھرتی محسوس ہوتی ہے۔

فیض احمد فیض کی طرح شیخ ایاز بھی ہمارے عہد کی ایک ایسی قد آور شخصیت ہیں جن کی شاعری کو ہم اپنے عہد کی آبرو کہہ سکتے ہیں، لیکن افسوس کی بات ہے کہ ہم نے ان کی شاعری کی طرف ایسی توجہ نہیں دی جس کی وہ مستحق ہے۔ شاید ہماری اس بے

حسی کو دیکھتے ہوئے انھوں نے اپنی شاعری کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا : "اے دھوئیں کے بالوں والی اگنی -- اے مری کویتا -- کیا آج تک کسی نے تیرے مکھڑے سے لٹیں ہٹا کر تجھے دیکھا ہے۔"

ہمیں اس حقیقت کا اعتراف کر لینا چاہیے کہ ان کی شاعری کی ماہیت پر وہ غور و فکر نہیں کیا گیا جس کی وہ مستحق ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ سندھ کی مٹی کی خوشبوؤں، یہاں کے مناظر کی رنگینیوں اور یہاں کی تہذیب و تمدن کی جلوہ سامانیوں کو اگر یک جا دیکھنا مقصود ہو تو شیخ ایاز کی شاعری کا مطالعہ از بس ضروری ہے۔ بڑے افسوس کی بات ہے کہ کچھ لوگوں نے انھیں اردو دشمن اور کچھ نے مذہب دشمن کہہ کر ناقابل اعتنا قرار دے دیا اور ان کا کلام پڑھنے کی زحمت گوارا نہ کی جس سے انھیں معلوم ہوتا کہ وہ سندھی اردو ملاپ کا تابندہ ستارہ اور ریاکاریوں سے الگ مذہب کی اصل روح کے نہایت قابل قدر امین ہیں۔

ہمدرد فاؤنڈیشن کی طرف سے آج شیخ ایاز کی خدمت میں وثیقۂ اعتراف کی پیش کش ان کے علمی، ادبی اور شعری کارناموں سے غفلت برتنے کے عمل کی تلافی تو نہیں ہے، پھر بھی ایک حقیر سی کوشش ہے کہ لوگوں کو ان کی شاعرانہ عظمت کا احساس دلا کر ان کی شاعری کی طرف متوجہ کیا جائے۔

(شام ہمدرد، کراچی ۱۲ مئی ۱۹۹۴ء)

آغا شاعر قزلباش

آغا شاعر قزلباش دبستان داغ کے نمائندہ شاعر ہیں۔ انھیں جانشین داغ ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ داغ اردو غزل میں ایک خاص اسلوب کے بانی اور عہد آفریں شاعر تھے۔ عہد آفریں اس معنی میں کہ ان کے زمانے میں ان کے انداز کا اتباع کرنا ایک عام چلن کی حیثیت اختیار کر گیا تھا جس کی وجہ سے ان کا عہد شاعری داغ کا عہد کہلاتا ہے۔ آغا شاعر قزلباش نے بھی عام روش کو دیکھتے ہوئے داغ سے رشتۂ تلمّذ استوار کیا اور اس رشتے کا حق ادا کرتے ہوئے داغ کے رنگ میں نہایت رنگین اور کیف آور غزلیں لکھیں۔

داغ ہی کی طرح آغا شاعر بھی صحت زبان اور محاوروں کے برمحل استعمال پر بہت زور دیتے تھے۔ وہ اس نکتے سے بخوبی واقف تھے کہ شاعری صرف اعلا خیالات کے اظہار کا نام نہیں ہے، بلکہ شاعری کی لازمی شرط انداز بیان ہے جس کے لیے لفظوں کا مزاج داں ہونا ضروری ہے۔ لفظوں کی مزاج دانی کے علاوہ شعری روایت کا رچاؤ بھی شعر کے لطف اور اثر کو دوبالا کر دیتا ہے۔ لہٰذا شعری روایت کو تخلیقی سطح پر اپنے وجود کا حصہ بنانا اعلا شاعری کی ضمانت ہے۔

آج کل کے کچھ شعرا جدیدیت کے شوق میں اپنی شعری روایت سے دور ہوتے جارہے ہیں جس کی وجہ سے ان کی شاعری بے مزہ ہو کر رہ گئی ہے۔ آغا شاعر قزلباش کا کلام ایسے شعرا کے لیے مشعل راہ ہو سکتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ذاتی دکھ درد اور کیفیت کرب کا اظہار بھی شاعری کی قدر و قیمت میں اضافے کا سبب بن سکتا ہے، لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جب شاعر کو اپنے دکھوں کے اظہار کے سلیقے پر بھی دسترس ہو۔ بہت سے جدید شعرا صرف دکھ درد ہی کو شاعری کا سرمایہ تصور کرتے ہیں اور یہ بھول

جاتے ہیں کہ یہ دکھ درد ان کے اپنے احساس کا حصہ ہیں۔ اس احساس میں دوسروں کو شریک کرنا شاعری ہے اور یہ اثر آفریں انداز کی متقاضی ہوتی ہے۔ آغا شاعر قزلباش نے اپنے کلام کو اثر آفریں بنانے کے لیے نہایت شوخ اور دل چسپ انداز اپنایا تھا۔

آغا شاعر کا یہ شوخ اور دل چسپ انداز صرف زبان و بیان پر ہی قدرت کا نتیجہ نہیں تھا، بلکہ وہ برصغیر کی مسلم تہذیب پر بھی گہری نظر رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنی پوری زندگی کو اس تہذیب کے رنگ میں اس طرح رنگ لیا تھا کہ وہ مسلم تہذیب کی پہچان اور مسلم تہذیب ان کی شناخت بن گئی تھی۔ ان کا کلام اور ان کا اسلوب حیات ہمارا قابل قدر تہذیبی سرمایہ ہے جس کی حفاظت کرنا ہمارا قومی فریضہ ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ ہم نے ان کے فن اور ان کی شخصیت پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی۔ اس کا ایک واضح ثبوت یہ ہے کہ آج تک ان کی کلیات یا دیوان شائع نہیں ہو سکا۔ البتہ پروفیسر مجتبیٰ حسین نے جو کتاب ان کے فن اور ان کی شخصیت پر لکھی ہے اس کے آخر میں ان کے کلام کا مختصر سا انتخاب دیا ہے۔ بس یہی کلام ہے جس تک ہماری پہنچ ہے۔ آغا شاعر نے غزلوں کے علاوہ کچھ تراجم بھی کیے ہیں جن میں عمر خیام کی رباعیات کا ترجمہ اردو اور فارسی زبانوں پر ان کی گرفت کا منھ بولتا ثبوت ہے۔

بہرحال آج کی یہ نشست بڑی اہمیت کی حامل ہے اور اس نشست کے اہتمام سے توقع ہوتی ہے کہ ہم آئندہ بھی آغا صاحب کے کارناموں کو نہ صرف خراج تحسین پیش کرتے رہیں گے، بلکہ ان کے کارناموں کو سامنے رکھ کر اپنی راہ بھی بنائیں گے۔

(۱۹۹۴ء)

عطاء الحق قاسمی

عطاء الحق قاسمی شاعر، نثر نگار اور کالم نویس کی حیثیت سے ملک بھر میں جانے پہچانے جاتے ہیں۔ شاعری میں ان کا ایک موقف ہے جس پر وہ پوری مضبوطی سے قائم ہیں۔ ان کا یہ موقف ان کی تخلیقات کو معاشرے سے مربوط رکھتا ہے۔ وہ اپنی ذات کی بند گلی میں خوف، دہشت اور مایوسیوں کے سائے میں زندگی بسر کرنے کے قائل نہیں ہیں۔ ان کے نزدیک یہ منفی رویہ ہے جو فن کار اور معاشرہ، دونوں کے لیے تباہ کن ثابت ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں اس منفی رویے کی ترویج و اشاعت بڑے پیمانے پر کی جارہی ہے۔ اس رویے کو اپنانے والے دراصل "کر کے گار" "دوستو وسکی" اور "کافکا" جیسے دانش وروں کی اتباع میں معاشرے کو ایک بوجھ تصور کرتے ہیں۔ یہ حضرات انسانی تاریخ، تہذیب و تمدن اور اخلاقی قدروں کو مسترد کرتے ہیں اور اپنے تخلیقی عمل کو صرف اپنی فردیت تک محدود کرتے ہیں۔ ان کے برعکس ایک رویہ ان دانش وروں کا ہے جو فرد پرستی کی جگہ سماجی حقیقت نگاری پر زور دیتے ہیں اور اپنی شاعری کے ذریعے سے زندگی کو نکھارنے، سنوارنے اور اسے بدلنے کے قائل ہیں۔ عطاء الحق قاسمی بھی بنیادی طور پر سماجی حقیقت نگاری کے دبستان سے وابستہ ہیں۔

یہاں ہمیں سماجی حقیقت نگاری کے بارے میں اپنا ذہن صاف کرلینا چاہیے۔ سماجی حقیقت نگاری کا مطلب یہ نہیں ہے کہ سماجی حالات کو ہوبہو بیان کر دیا جائے۔ اس دبستان کے شاعر اور دوسرے فن کار دراصل اپنے متخیلہ کی مدد سے حالات کے پس منظر میں کارفرما عوامل کو پیش کرتے ہیں، کیوں کہ یہ عوامل عام نظروں سے اوجھل ہوتے ہیں، لہٰذا جب شعرا انھیں منظر عام پر لاتے ہیں تو قارئین ورطۂ حیرت میں پڑ جاتے ہیں اور شاید تحیر کی یہ کیفیت پیدا کر دینا ہی سچی شاعری کی شناخت ہے۔

عطاء الحق قاسمی اپنی شاعری میں متخیلہ کو پوری طرح بروئے کار لاکر حیرت و استعجاب کی فضا ابھارتے ہیں۔ حیرت کی یہ فضا قارئین کو سوچنے کی اور تعمیری سمت میں عمل کی دعوت دیتی ہے۔

ہم نے یہاں متخیلہ کی کارفرمائی پر زور دیا ہے جو خالص عقلی استدلال سے مختلف ہوتی ہے۔ عقلی استدلال حالات کو ہوبہو پیش کرنے اور ان کا تجزیہ کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اور صحافت یا خالص علمی مضامین کے لیے ضروری سمجھا جاتا ہے، جب کہ تخلیقی عمل کے لیے متخیلہ سے کام لینا ہوتا ہے۔ یہاں یہ بات ذہن نشین کرلینی چاہیے کہ متخیلہ کسی طرح بھی تعقل کی ضد نہیں ہے، بلکہ تعقل کی ایک لطیف صورت کا نام ہے۔

شاعری کے علاوہ عطاء الحق قاسمی اپنے مزاحیہ کالموں کے ذریعے سے بھی کیف آور تحیر کی کیفیت ابھارتے ہیں۔ مزاح نگاری کو پھکڑپن سے تعبیر کرنا درست نہیں ہے۔ مزاح نگار کے لیے ذہانت اور لفظوں پر پوری گرفت ہونا پہلی شرط ہے۔ ہمارے ہاں اس میدان کے سب سے بڑے شہ سوار اکبر الٰہ آبادی تھے جنھوں نے اپنے طنز و مزاح سے اپنے معاشرے کو سدھارنے کی بے مثال کوشش کی ہے۔ مزاح نگار نہایت خوب صورت انداز سے معاشرے کی خرابیوں کو ابھارتا ہے اور درپردہ ان خرابیوں کو دور کرنے کی راہ ہموار کرتا ہے۔ عطاء الحق قاسمی اپنے فکاہیہ کالموں کے ذریعے سے یہی سب کچھ کرتے ہیں۔

عطاء الحق قاسمی کی ہمہ جہت شخصیت کو وثیقۂ اعتراف پیش کرنا ہمدرد فاؤنڈیشن کے لیے باعث مسرت ہے۔

(شام ہمدرد، لاہور ۴۔ اگست ۱۹۹۴ء)

تہذیب و شائستگی کی شاعرہ

محترمہ ادا جعفری صاحبہ تہذیب و شائستگی کی ایک زندہ مثال ہیں۔ ان کی شاعری بھی ان کے مہذب و شائستہ رویے کی نہایت دل نشین انداز سے عکاسی کرتی ہے۔ وہ بنیادی طور پر ایک ترقی پسند شاعرہ ہیں۔ ترقی پسند ادب کی تحریک دراصل ایک عالمی تحریک ہے جو ہمارے ملک میں یورپ کی ترقی پسند تحریکوں کے زیر سایہ پروان چڑھی جس کا جیتا جاگتا ثبوت یہ ہے کہ سب سے پہلے سجاد ظہیر اور دوسرے ادیبوں نے ۱۹۳۵ء میں "انجمن ترقی پسند مصنفین" لندن میں قائم کی اور اس کے بعد ۱۹۳۶ء میں اسے برصغیر میں قائم کیا گیا۔

دراصل اردو ادب میں صرف دو ایسی بڑی تحریکیں ہیں جن کا اثر ہمارے ادب پر نمایاں طور پر محسوس کیا جاتا ہے۔ ان میں پہلی تحریک سرسید تحریک ہے اور دوسری ترقی پسند تحریک۔ سرسید تحریک نے اردو ادب کو عقلیت اور افادیت سے روشناس کرایا۔ اس تحریک کے رہنماؤں میں سرسید، مولانا حالی، مولانا محمد حسین آزاد، مولوی ڈپٹی نذیر احمد اور علامہ شبلی پیش پیش ہیں۔

ترقی پسند ادب کی تحریک ایک طرح سے سرسید تحریک ہی کی توسیع ہے۔ سرسید تحریک کے عقلیت و افادیت کے رویے کو روز مرہ زندگی سے براہ راست مربوط کر کے سیاسی، سماجی اور معاشی مسائل کو تخلیقی انداز سے پیش کرنا ترقی پسندی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ترقی پسند ادیبوں کی تحریروں کو حقیقت نگاری بلکہ سماجی حقیقت نگاری کا نام دیا جاتا ہے، لیکن ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات میں حقیقت یا خارجی اشیا، مناظر اور کوائف کو بالکل اس طرح پیش نہیں کیا جاتا جیسے کہ وہ ہیں یعنی ترقی پسند شاعر اور ادیب خارجی دنیا کی ہو بہو تصویر نہیں کھینچتے، بلکہ وہ انھیں اس طرح پیش کرتے ہیں جس

طرح وہ محسوس کرتے ہیں۔ خارجی حقائق کو اپنے احساسات کی صورت میں پیش کرنے کے لیے حِسّی طرز اظہار کی ضرور ہوتی ہے اور یہ طرز اظہار حقیقت کو حِسّی پیکروں' تمثالوں' علامتوں اور استعاروں کی زبان فراہم کرتا ہے۔

مولانا حسرت موہانی اور مولوی عبدالحق جیسے دانش وروں نے ترقی پسند تحریک کی بڑے کھلے دل سے حمایت کی تھی۔ اس تحریک کے ابتدائی نمائندوں میں سجاد ظہیر' احمد علی' اختر حسین رائے پوری' رشید جہاں اور مجنوں گورکھپوری جیسے دانش ور شامل رہے ہیں۔ ترقی پسند تحریک کی پہلی کتاب جس نے پورے ملک میں تہلکا مچا دیا تھا' ایک افسانوں کا مجموعہ تھا جس کا نام "انگارے" تھا۔ اس مجموعے میں سجاد ظہیر' احمد علی' رشید جہاں وغیرہ جیسے افسانہ نگاروں کے افسانے شامل تھے۔

ترقی پسند تحریک کے متوازی ہیئت پرستوں کی تحریک تھی جو ادب کی افادی اور سماجی قدروں کو کوئی اہمیت نہیں دیتی تھی۔ اس کے نزدیک ادب کا مقصد خود ادب تھا جسے زندگی سے مربوط کرنا درست نہیں تھا۔ اس دبستان کے نمائندہ ادیب اور شعرا میں میرا جی' ن م راشد اور قیوم نظر وغیرہ شامل تھے۔ علامہ نیاز فتح پوری کو بھی اسی دبستان سے وابستہ تصور کیا جاتا ہے' لیکن ہیئت پرستوں کی تحریک ہمارے ملک میں زیادہ جڑیں نہ پکڑ سکی اور اس کو وہ مقبولیت حاصل نہ ہو سکی جو ترقی پسند تحریک کو حاصل تھی۔

عقلیت و سماجیت محترمہ ادا جعفری کے مزاج کا حصہ اور ان کے لہو میں دوڑتی ہوئی حقیقت ہے' لہٰذا ترقی پسندی کے رجحان کو انھوں نے طبعاً اپنایا ہے جس کا اندازہ ان کے ابتدائی کلام سے آج تک کے کلام کے مطالعے سے بخوبی ہو سکتا ہے۔ انھوں نے نام نہاد جدیدیت پرستی' ہیئت پرستی یا کسی بھی ایسی تحریک سے خود کو وابستہ نہیں کیا جو زندگی سے آنکھیں چرا کر ذات کے خول میں بند ہونے کی ترغیب دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری بامعنی نشاط انگیزی سے آراستہ اور تمام حلقوں میں مقبول ہے۔

(شام ہمدرد' کراچی ۱۴ اپریل ۱۹۹۴ء)

ہمدرد

HAMDARD

ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان، کراچی